ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریا گنج

"انسان کے دل کی دھڑکنیں اس سے کہہ
رہی ہیں کہ زندگی چند منٹ اور سکنڈ کا نام ہے لہذا اپنی موت
کے بعد اپنی شخصیت کی یاد کو باقی رکھنے کی کوشش کرو کیونکہ
تذکرہ اور یاد ہی انسان کی حیات ثانی ہے۔"

(احمد شوقی)

[illegible]

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریا گنج

شمارہ ۸۔۹	جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ اگست و ستمبر ۲۰۰۰ء	جلد نمبر ۱۷

معاون مدیر	مدیر مسئول
انیس احمد فلاحی مدنی	ابوالمکارم ازہری

☆ طلبہ کے لیے: ۴۰ روپے ☆ اعزازی زرتعاون: ۱۰۰۰ روپے ☆ اس شمارہ کی قیمت: ۷ روپے	☆ سالانہ زرتعاون: ۵۰ روپے ☆ خصوصی زرتعاون: ۱۰۰ روپے ☆ بیرون ملک: ۲۵ امریکی ڈالر

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے
لہٰذا جلد از جلد سالانہ زرتعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ مجلہ حیات نو، جامعۃ الفلاح

بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱

Phone: 05466-28115

شاداب آفسٹ پریس شاہ گڑھ

نقوش حیات نو

○ اداریہ

مدارس کے خلاف بدگمانیاں — افتخار الحسن مظہری — ۳

○ ہدایت کے چراغ

سالم بن عبداللہ بن عمر — ابو جلیس ندوی — ۵

○ اصولی مباحث

فن جرح و تعدیل ایک مختصر تعارف (۲) — ڈاکٹر عاطف احمد امان — ۹

○ بحث و نظر

اسلام میں حکومت الٰہیہ کی اہمیت — مفتی کلیم رحمانی — ۱۳

میراث، حقوق ملکیت اور عورتوں کا مالی تحفظ — ملک ظہیر — ۲۲

○ تلخ و شیریں

میرا گلا خراب ہے — ثناء اللہ سیالکوٹی — ۳۷

○ مذاہب عالم

ہندو مت

ایکو واسشٹ اور ویدانت — انیس احمد فلاحی — ۳۹

○ فقہ و فتاویٰ

بابری مسجد کی تعمیر نو — محمد طاہر مدنی — ۴۳

○ تعارف و تبصرہ

اھدنا الصراط المستقیم — ولی اللہ مجید قاسمی — ۴۴

○ جامعہ کے لیل و نہار

مسجد کے بیرونی حصوں میں دو روپیہ تعمیر کاری — ادارہ — ۴۶

........اور کارواں بنتا گیا

چار کمپیوٹر سیٹ

جامعہ میں سرپرستان طلبہ بلریا گنج کا اجتماع

میڈیکل کیمپ

اظہار تعزیت

اداریہ

مدارس کے خلاف بدگمانیاں

افتخار الحسن مظہری

شرافت و اخلاق کی بنیاد پر انسانیت کی تعمیر یا بالفاظ دیگر دنیا کو جینے کے لائق بنائے رکھنے کی کوشش کرنا وطن کی محبت کا اولین تقاضا ہے۔

ہمارا بھارت ایک تکثیری معاشرے کا ملک ہے جس میں عقائد و ثقافت و زبان کی مختلف اکائیاں آباد ہیں یہ اکائیاں اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے دوسری اکائیوں کے شانہ بشانہ وطن کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتی ہیں۔

مسلمان یہاں کی اہم ترین اکائی ہیں مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اپنے متعدد قومی اور وطنی افتخار و امتیاز کی بنا پر وہ اس ملک کی شناخت کا اہم جزو ہو گئے ہیں، ایسا اہم جزو کہ مسلمانوں کے بغیر اس ملک کا تعارف نامکمل اور اس کی تاریخ ناتمام رہے گی۔

مسلمانوں کے اس قومی و وطنی افتخار و امتیاز کے منابع و مصادر میں عقیدہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس کی آبیاری یا اشاعت و ترویج کا مرکز وہ مدارس ہیں جو کسی سرکاری امداد کے بغیر زندہ رہ کر زندگی کی روح اور اس کا جوہر بانٹتے ہیں۔ اور ان ہی مدارس کے پروردہ وہ اساتذہ و طلبہ ہیں جو کسی مادی منفعت اور معاشی خوش حالی کے تصور سے خالی الذہن اور لذائذ عشرت سے بے نیاز ہو کر اخلاق و انسانیت، امانت و دیانت، شرافت و طہارت اور تہذیب آدمیت کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔

ملک کی صد سالہ تاریخ مدارس کی یہی تصویر پیش کرتی ہے اور آج بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی بلندی اور سیرت و کردار کی تعمیر کے ذریعہ ملک کو ایسے شہری اور فضل و شرف کے ایسے نمایندے مہیا کرتے ہیں جو اس خطۂ ارض کو زیادہ سے زیادہ جینے کے لائق زندگی کے لئے پر امن و پر آسائش بنانے میں نمایندہ کردار ادا کر سکیں تاکہ سیاسی معاشی اور سماجی ناانصافیاں

یہاں سے دور ہوں، اونچ نیچ کا خاتمہ ہو اور ہر طبقہ کا ہر فرد مساویانہ حقوق اور شعور احترام ذات سے بہرہ ور ہو کر سرشار ہو کر حقیقت کا یہ راگ چھیڑ دے کہ:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن ملک کا ایک مخصوص طبقہ مدارس کی ان بے لوث خدمات کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اس شک کی کوئی بنیاد ہزار کوشش کے باوجود اب تک اب تک اس کو حاصل نہیں ہو سکی پھر بھی وہ مصر ہے کہ مدارس دہشت گردی کی تربیت گاہ ہیں اس لئے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی یہ الزام تراشی اقلیتوں کے خلاف کسی خطرناک منصوبے کے عملی نفاذ کی بہانہ جوئی نہ ہو۔

قتل کی روایت پر جس کی تہذیبی اساس قائم ہو وہ طبقہ برسر اقتدار آجائے تو ملک کا داخلی نظام انسانیت و اخلاق کی آبیاری کے لئے کتنا سازگار ہوگا اور ظلم و بربریت کے لئے کتنا؛ موافق اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس طبقہ کا ایک سرکردہ لیڈر کسی موقعہ پر ایک مسلمان خاتون کا قتل کر دیتا ہے تو اس قتل کی خبر کو فاتحانہ سرور و غرور کے ساتھ اپنی نمایاں کارگذاری کے طور پر اخبار کی سرخیوں میں دیتا ہے۔ اس سے قتل و غارتگری کا ماحول بنانے، جبر و ظلم اور بربریت کے کونچکاں واقعات کے بار بار اعادے میں دلچسپی کی جس ذہنیت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے اس کا مظہر کانپور، بلرامپور، پھولپور، الہ آباد، لکھنؤ، مراد آباد، میرٹھ، گونڈہ، بہرائچ اور سدھارتھ نگر کے واقعات ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ طبقہ بطور خاص مسلمانوں کے درپے ہے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے خلاف اس کے منصوبے کے بنیادی نکات کیا ہیں تو اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ☆☆

ہدایت کے چراغ

سالم بن عبداللہ بن عمرؓ

یہ فاروقی عہد ہے، مدینہ کی گلیوں میں دولت کا سیلاب امڈ آیا ہے، ایران کے آخری تاجدار شہنشاہ یزدگرد کے شاہی خزانے اور زر و جواہر کے انبار ہیں جو مسلمانوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ کہیں کسریٰ کا تاج ہے تو کہیں یاقوت و مرجان کے جڑاؤ والی تلواریں، کہیں قیمتی نگینوں کی انگوٹھیاں ہیں تو کہیں شاہی بیگمات کے خوبصورت ترین زیورات۔

دولت کی اس بہتات کے ساتھ ایران کے بے شمار ایسے جنگی قیدی بھی ہیں جن کے مرتبہ و مقام پر اوج ثریا رشک کرے۔ ان ہی قیدیوں میں شہنشاہ ایران کی وہ شہزادی بھی تھی جو عبداللہ بن عمرؓ کے نکاح میں آئی۔ جس کے بطن سے عبداللہ بن عمر کے ایک لڑکا تولد ہوا۔ جسکا نام سالم تجویز کیا گیا۔ جو شکل و صورت کے ساتھ ساتھ کردار و سیرت میں بھی حضرت عمرؓ کے مانند و مشابہ تھا۔

آیئے ان کی زندگی کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھا کے دیکھا جائے کہ دین و ایمان کی جو روشنی دل سے پھوٹتی ہے وہ ہمارے دلوں کی سیاہی کس حد تک دور کرتی ہے۔

مہبط وحی و الہام فرودگاہ قدسیان فلک، جلوہ گاہ نبوت یعنی مدینہ کے گہوارۂ خیر و برکت میں سالم نے زندگی کی پہلی صبح دیکھی۔ جلیل القدر صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آغوش تربیت میں پرورش پا کر نشو و نما کے مراحل طے کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالم کی فطرت میں فضل و کمال کے پوشیدہ جوہر بچپن ہی میں نکھر کر نمایاں ہو گئے۔ اور زیادہ دن نہ گذرے کہ وہ مدینہ کے ان سات معتمد اور معتبر فقہاء میں شمار کئے جانے لگے جن کے مشورہ کے بغیر حکومت وقت کسی اہم معاملے میں کوئی اہم فیصلہ نہیں کرتی تھی۔

سالم بن عبداللہ کی عظمت شان کچھ ایسی تھی کہ حکومت کے ان ہی والیوں کو لوگ زیادہ معتمد اور معتبر سمجھتے تھے جو سالم کے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام یا تصفیہ نہ کریں، رہے وہ والیان ریاست جو سالم سے رائے و مشورہ کو ضروری نہ سمجھیں تو ایسے والا کو مدینہ برداشت نہ کرتا تھا۔

ایک بار یزید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں، عبدالرحمن بن ضحاک مدینہ کے والی مقرر

ہو کر آئے، اس وقت حضرت حسینؓ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ بیوگی کی زندگی گذار رہی تھیں اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے یکسو رہنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔ ابن ضحاک نے ان کو شادی کا پیغام دیا۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے خیال سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ابن ضحاک نے بار بار اصرار کیا لیکن اس کے شر کے خوف سے کوئی سخت جواب دینے کے بجائے موزوں طریقے سے عذر پیش کرنے پر اکتفا کرتیں۔

ابن ضحاک نے دیکھا کہ وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہی ہیں تو اس نے ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہا "سن لیجئے اگر شادی کے لئے رضامند نہ ہوئیں تو آپ کے بڑے صاحبزادے کو بہت شراب نوشی میں گرفتار کرلوں گا اور اسکی میت پر تازیانے برساؤں گا۔ فاطمہ پریشان ہو گئیں۔ فوراً سالم بن عبداللہ سے مشورہ کیا، انہوں نے کہا کہ اپنی شکایات لکھ کر فوراً خلیفہ کے پاس بھیج دیں۔ مشورہ کے مطابق انہوں نے خط لکھا اور قاصد کے ذریعہ دمشق روانہ کیا۔ قاصد خط لیکر ابھی راستہ ہی میں تھا کہ مدینے کے سرکاری خازن ابن ہرمز کے پاس خلیفہ کا حکم پہنچا کہ دارالخلافہ پہنچ کر مالی حسابات کی تفصیلات سے خلیفہ کو آگاہ کرے۔

ابن ہرمز نے سب حسابات صاف کئے اور روانگی سے پہلے فاطمہؓ سے بھی ملنے گئے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ خلیفہ کو ان سے غایت درجہ عقیدت و محبت ہے۔ اس لئے ان کے حالات و معاملات جاننے کا خلیفہ کو بڑا اشتیاق رہتا ہے۔ فاطمہؓ سے ملکر انہوں نے کہا کہ میں کل دمشق جا رہا ہوں خلیفہ سے کچھ کہنا ہو تو فرمائیں۔

فاطمہ نے کہا۔ دیکھو ابن ضحاک میرے درپے آزار ہے۔ سالم ابن عبداللہ نے بھی اسکی فہمائش کی لیکن وہ باز نہ آیا مسلسل مجھے تنگ کئے جا رہا ہے۔ یہی بات خلیفہ کے گوش گذار کر دینا۔

ابن ہرمز پر چونکہ ابن ضحاک کے منصب کا ایک گونہ دباؤ تھا۔ اسلئے وہ اس سے مرعوب تھا اور ابھی کوئی شکایت خلیفہ تک پہنچانے میں خوف کی نفسیات اسکا گلا دباتی تھی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کیوں فاطمہ سے ملکر اپنے یہ مصیبت خود گلے لگائی۔

ادھر اتفاق ایسا ہوا کہ جس دن ابن ہرمز دمشق پہنچا اسی دن فاطمہ کا قاصد بھی خط لیکر وہاں

پہنچا خلیفہ نے ابن ہرمز سے مدینہ کے حالات معلوم کئے سالم ابن عبداللہ کی خیر و عافیت دریافت کی پھر کہا کہ اور کوئی قابل ذکر بات ہو تو بتاؤ اس نے ڈر کی وجہ سے فاطمہ کے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ابن ہرمز ابھی خلیفہ کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ دربان نے آکر فاطمہ کے قاصد کے لئے حاضری کی اجازت طلب کی۔ ابن ہرمز کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سہمی ہوئی آواز میں کہا فاطمہ بنت حسین ان دنوں کچھ پریشان ہیں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں انکی پریشانی کی اطلاع آپ کو بھی بہم پہنچا دوں پھر قاصد سے ابن ضحاک کا پورا معاملہ بیان کر دیا۔

یہ سنتے ہی خلیفہ کے چہرے سے چنگاریاں اڑنے لگیں وہ بھڑک کر تخت سے نیچے اترا اور گرج کر بولا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم نے اب تک یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔ میں نے تم سے اہل مدینہ کے حالات پوچھے لیکن اتنی اہم بات تم نے مجھ سے چھپائے رکھی۔ ابن ہرمز نے عذر نسیان کا سہارا لیکر خلیفہ کا غصہ فرو کیا۔ پھر فاطمہ کا قاصد آیا اور انکا خط پیش خدمت کیا۔ خلیفہ خط پڑھتا جاتا اور غصہ کی وجہ سے اپنا غصہ زمین پر اتارتا جاتا اور کہتا جاتا۔

ابن ضحاک کی یہ جرأت کہ رسول اللہ ﷺ کی آل و اولاد کے ساتھ ایسی گستاخی کرے اور سالم بن عبداللہ جیسے بزرگ عالم دین کے مشورے کو بھی نظر انداز کر دے۔ خلیفہ نے پھر آواز بلند کی اور کہا۔

"کون ہے جو مدینہ جا کر ابن ضحاک کو ایسی سخت سزا دے کہ اسکی چیخ سے پورا دمشق گونج اٹھے"۔ آواز آئی۔ "حکم کی تعمیل کی جائے گی"۔ عبدالواحد بن بشیر تعمیل حکم کے لئے موزوں ہوگا۔ جو اس وقت طائف میں ہے۔ خلیفہ نے قلم و قرطاس طلب کیا اور لکھا امیر المومنین یزید بن عبدالملک کی جانب سے عبدالواحد بن بشیر کے لئے۔

السلام علیکم

میں تم کو مدینہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں، یہ خط ملتے ہی تم مدینے پہنچ جاؤ اور ابن ضحاک کو برطرف کر دو اور اس پر چالیس ہزار دینار کا جرمانہ عائد کر کے اسے ایسی سخت سزا دو کہ اسکی چیخ سے پورا ملک گونج اٹھے اور میں قصر خلافت میں اسکی آواز اپنے کانوں سے سن سکوں۔

خط لیکر عبدالواحد مدینہ پہنچے تو ابن ضحاک کے پاس نہ گئے اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

فوراً عبدالواحد کو اپنے گھر بلالیا اور مدینہ آنے کی غرض پوچھی لیکن انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کیا۔ ابن ضحاک نے اپنے فرش کا ایک کونہ اٹھایا اور کہا:۔ ”دیکھو! یہ ایک ہزار دینار ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم مدینہ آنے کی اپنی غرض بتادو اور خلیفہ کا حکمنامہ مجھے سنادو تو یہ سارے دینار تمہارے حوالے، کسی غیر کو کوئی خبر نہ ہوگی۔ اس نے دینار لیا اور حکمنامہ اسے پڑھ کر سنادیا۔ اب ابن ضحاک نے کہا کہ عبدالواحد! میرے دمشق پہنچنے تک تم یہاں تین دن ٹھہرو، پھر حکم کی تعمیل کرنا۔

پھر ابن ضحاک دمشق کے لئے روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر خلیفہ کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کے پاس پہنچا جو بہت نرم دل، بلند اخلاق اور نیک مزاج تھا۔ اس کے پاس پہنچتے ہی فریاد کی کہ اے امیر مجھے اپنی پناہ کی بھیک دیجئے۔

مسلمہ:۔ [illegible] تمہارا اعتماد رہو۔

ابن ضحاک:۔ میری ایک لغزش امیر المومنین کے عتاب کا سبب بن گئی۔

مسلمہ:۔ فوراً یزید کے پاس پہنچے، عرض کیا کہ میں ایک امید کرم لیکر حاضر ہوا ہوں۔

یزید:۔ تمہاری امید پوری کی جائے گی۔ بشرطیکہ ابن ضحاک سے متعلق نہ ہو۔

مسلمہ:۔ میں اسی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

یزید:۔ اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔

مسلمہ:۔ وہ جرم کیا ہے؟

یزید:۔ اس نے فاطمہ بنت حسین کے ساتھ گستاخی کی، ان کو تنگ کیا، ڈرایا دھمکایا۔ پھر اس معاملہ میں سالم بن عبداللہ کے مشورہ کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ مدینہ کے تمام علماء، فقہاء، ادباء اور شعراء اس کی مذمت لکھتے ہیں۔

مسلمہ:۔ اب آپ کی مرضی۔

یزید:۔ اس سے کہدو کہ فوراً مدینہ چلا جائے تاکہ اس کے بارے میں جس کارروائی کا حکم جاری کیا گیا ہے، نیا گورنر اس کی تنفیذ کرسکے، اور دوسرے گورنروں کے لئے عبرت و موعظت کی ایک مثال قائم کرسکے۔

نئے گورنر کی تقرری سے اہل مدینہ بہت خوش ہوئے۔ انھیں اس بات کی مزید خوشی حاصل ہوئی کہ نئے گورنر نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں کوئی کوتاہی نہ دکھائی۔ اہل مدینہ کو نئے گورنر سے بڑی عقیدت و محبت ہوگئی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سالم بن عبداللہ کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔

اصولی مباحث

فن جرح وتعدیل

ایک مختصر تعارف (۲)

ڈاکٹر عاصف احمد اعوان
شیخ التفسیر جامعہ قطر

جرح پر ایک اعتراض اور اس کا ازالہ:

بعض علماء جرح کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں مسلم کی غیبت اور اس کے پوشیدہ عیوب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور اسلام غیبت کرنے اور پوشیدہ عیوب کے اظہار سے منع کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔ ”اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ سورۃ الحجرات۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ اے وہ لوگو! جو ظاہراً ایمان لائے ہو مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور نہ ہی انکے پوشیدہ عیوب کو تلاش کرو۔ کیوں کہ جو شخص مسلمانوں کے پوشیدہ عیوب کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے عیوب سے پردہ کھول دیتا ہے۔ اور جس کے عیوب اللہ تعالیٰ تلاش کرنے لگے اسے اس کے گھر میں رسوا کردیتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے۔ جس نے کسی مسلمان کے عیوب پر پردہ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ اسکے عیوب پر دنیا و آخرت میں پردہ ڈالے گا۔

یہ شبہ ضعیف اور غیر معقول ہے۔ کیونکہ شریعت کی حفاظت (سنت جس کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے) ہم پر واجب ہے اور جرح و تعدیل کے بغیر صادق کا کاذب سے، عادل کا فاسق سے، ضابط کا مغفل سے علیحدہ کرنا اور روایات کو وضع و اختلاط سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔ اور چونکہ جرح روایت کی حفاظت کے لئے ایک ضرورت ہے اور ضرورتیں محظور و ممنوع اشیاء کو بھی مباح کراتی ہیں۔ لہٰذا اس قاعدہ کی رو سے راویوں کے احوال خیر و بد کو بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ صادق راویوں کی جھوٹے اور کذاب راویوں سے تمیز کی جاسکے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اور متعدد احادیث رسول اللہ ﷺ، اخبار و روایات کے باب میں احتیاط و تثبت کو واجب کرتی ہیں۔ ان نصوص کی روشنی میں فاسق و فاجر راویوں کے احوال بد کو بیان کرنا ہم پر واجب ہوگا۔ تاکہ کہ عوام اور علماء ان کے کذب و افتراء اور دجل و فریب سے بچ سکیں۔ ارشاد باری ہے۔ ”اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو“ ارشاد رسول ﷺ ہے: ”دین نصح و خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ

کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ اور اسکے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے امراء کے لیے" نبی اکرم ﷺ کی خیر خواہی کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کی سنت کا دفاع کریں۔ بایں طور کہ اس کے راویوں کے احوال خیر و بد کو بیان کیا جائے تاکہ کوئی محدوں، زندیقوں اور غیر عادل اور مغفل راویوں سے مروی احادیث سے دھوکہ نہ کھا جائے۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ راویوں کے احوال بد کو بیان کرنا بالاتفاق غیبت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک شخص کے عیوب سے پردہ اٹھ جانے کا معاملہ سنت و روایت کے ضیاع سے کہیں زیادہ ہلکا معاملہ ہے۔ اور جہاں کہیں دو مصلحتیں ٹکرا جائیں وہاں عظیم تر مصلحت کا لحاظ کیا جائے گا۔ اسی قاعدہ کا لحاظ کرتے ہوئے علماء نے چھ مواقع پر غیبت کی اجازت دی ہے۔

علماء سلف کے طرز عمل سے جرح کے جواز کا ثبوت

نبی اکرم ﷺ نے متعدد احادیث میں وضاعین اور کذابین سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی۔ مسلم شریف میں ہے۔ "آخری زمانے میں چند کذابوں اور دجالوں کا ظہور ہوگا۔ جو ایسی حدیثیں گھڑ کر لائیں گے۔ جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ ہی تمہارے آباء و اجداد نے لہذا ان سے چوکنا رہنا کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں۔

آپ ﷺ کی اسی قبیل کی ہدایات کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین نے روایت کو قبول کرنے کے باب میں حزم و احتیاط سے کام لیا اور خصوصا فتنہ (مقتل عثمان) کے دور کے بعد تو روایات کو قبول کرنے میں حد سے زیادہ سختی کی جانے لگی۔ صحابہ کے بعد اس منہج کو تابعین نے اور ان کے بعد تبع تابعین نے اپنائے رکھا اور راویوں کے احوال خیر و بد کو بیان کرنے کو عبادت سمجھتے ہوئے انہوں نے اس فن کو آگے بڑھایا کیونکہ روایت دین کا مصدر ثانی ہیں۔ لہذا موضوع و مکذوب اور مختلط روایات سے صحیح روایات کو بچانا۔ انہوں نے اپنی ذمہ داری سمجھی۔ عبداللہ بن المبارک نے ایک راوی کے بارے میں فرمایا وہ جھوٹا ہے۔ لوگوں نے کہا "اے عبدالرحمن آپ غیبت کررہے ہیں تو آپ نے جواب دیا خاموش رہو۔ اگر ہم راویوں کے احوال نہ بیان کریں گے تو حق و باطل کے درمیان تمیز کیونکر ہوگی۔

عاصم احول سے روایت ہے کہ قتادہ کی مجلس میں عمرو بن عبید کا تذکرہ ہوا تو آپ نے

ان کی شکایت کی تو میں نے کہا کہ میں نے علماء کو ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے تو انہوں نے جواب دیا اے احول کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جب کوئی شخص بدعت کی راہ پر چل پڑے تو اس کی اس حیثیت کا بیان واجب ہوگا۔ تاکہ لوگ اس سے چوکنا رہیں۔

یحیی بن سعید القطان نے جب بعض راویوں کی حدیثیں چھوڑ دیں تو لوگوں نے پوچھا اے یحیی کیا آپ کو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز آپ کے فریق ہو جائیں گے تو آپ نے جواب دیا قیامت کے روز ان کا میرا فریق ہونا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اس امر سے کہ خود آپ ﷺ میرے فریق ہو جائیں اور بارگاہ ایزدی میں یہ دعوی کردیں کہ تو نے میری حدیثوں کا دفاع کیوں نہ کیا۔

جرح کے باب میں ائمہ جرح نے قرابتوں اور دوستی کا بھی پاس و لحاظ نہ کیا چنانچہ علی بن المدینی سے جب انکے والد کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا انکے متعلق دوسروں سے پوچھ لو لوگوں کے اصرار پر جواب دیا: ضعیف ہیں۔

امام ابوداؤد نے اپنے بیٹے ابوبکر اور زید بن ابی انیسہ نے اپنے بھائی سے روایات لینے سے منع فرمایا۔

یہی نہیں بلکہ جب انہیں اپنی کسی روات کے بارے شک ہو گیا کہ شاید وہ اس کا کچھ حصہ بھول رہے ہیں تو انہوں نے اپنی ہی روایت کردہ حدیث کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ مشہور امام شعبہ بن الحجاج نے ایک روایت بیان کی لوگوں نے کہا آپ نے اس حدیث میں ثقہ راویوں کی مخالفت کی ہے آپ نے پوچھا کس کی لوگوں نے جواب دیا سفیان الثوری کی تو اس پر آپ نے فرمایا میری حدیث چھوڑ دو کیونکہ سفیان کا حافظہ مجھ سے زیادہ قوی ہے۔

ائمہ جرح و تعدیل کی قسمیں

امام ذہبی نے ائمہ جرح و تعدیل کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

بعض ائمہ نے جملہ راویوں پر کلام کیا ہے جیسے ابن معین اور ابو حاتم اور بعض نے اکثر راویوں پر کلام کیا ہے جیسے امام مالک اور شعبہ اور بعض نے صرف چند راویوں پر گفتگو کی ہے جیسے ابن عیینہ اور امام شافعی اور پھر ان کی تین قسم ہے۔

۱۔ **طبقہ متشددین :** اگر کسی متشدد امام نے کسی راوی پر کلام کیا ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ کیا کسی اور امام نے بھی ان کی موافقت کی ہے، اگر کی ہے تو وہ راوی ضعیف ہوگا اور اگر نہ کی ہو تو ان کی جرح اسی وقت مقبول ہوگی جب اس کے اسباب بیان کردیے گئے ہوں متشددین کے چار طبقے ہیں پہلے طبقہ میں شعبہؒ اور سفیانؒ ثوری ہیں اور شعبہ سفیانؒ سے بھی زیادہ متشدد ہیں یحییٰ القطانؒ اور عبدالرحمٰنؒ بن مہدی دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یحییٰ بن معینؒ اور احمد بن حنبلؒ کا تعلق تیسرے طبقہ سے ہے اور چوتھے طبقہ میں ابو حاتمؒ اور امام بخاریؒ آتے ہیں۔

۲۔ طبقہ متساہلین جیسے امام ترمذی اور امام حاکم۔

۳۔ طبقہ معتدلین جیسے امام دارقطنی اور ابن عدی۔

مذکورہ بالا ائمہ فن جرح و تعدیل کے مشہور امام ہیں بعد کے علماء نے انھیں کی کتابوں اور اقوال پر اعتماد کرتے ہوئے اس فن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور ان کا دائرہ تبویب و ترتیب اور تہذیب و تلخیص تک محدود رہا ہے۔

قرآنِ کریم کا مستند عبرانی ترجمہ :

اسرائیل نے قرآنِ کریم کا محرف عبرانی ترجمہ کافی مقدار میں شائع کراکر پورے فلسطین میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ قرآن کریم کا صحیح اور مستند عبرانی ترجمہ شائع کیا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے مجمع الملک فہد (مدینہ منورہ) نے قرآن کریم کا صحیح اور مستند عبرانی ترجمہ کراکر اپنے یہاں سے اسے شائع کرا لیا ہے۔ یہ اطلاع مجمع الملک فہد کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر محمد بن سالم بن شدید العوفی نے اخبار العالم الاسلامی کو دی ہے۔

اسلام میں حکومتِ الٰہیہ کی اہمیت

مفتی کلیم رحمانی۔ پوسد۔ مہاراشٹر

دین اسلام میں حکومت الٰہیہ کا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں قوت کا مقام ہے، جس طرح انسانی جسم قوت کے بغیر معطل ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام حکومت الٰہیہ کے بغیر معطل ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک اصل مقصود دین اسلام کا قیام ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت الٰہیہ اس مقصود کے لئے لازمی شرط ہے، حکومت الٰہیہ کے بغیر دین اسلام پورے طور پر قائم ہو ہی نہیں سکتا جیسے نماز ایک مقصودی عبادت ہے لیکن اس کیلئے وضو یا تیمم کا ہونا شرط ہے، اسی طرح دین اسلام کا قیام ایک مقصودی فریضہ ہے لیکن اس کیلئے حکومت الٰہیہ ایک لازمی شرط ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے بغیر دین کا کوئی کام نہ کرے بلکہ حکومت الٰہیہ کے بغیر دین کے جتنے کام کئے جاسکتے ہیں انہیں ضرور کرے لیکن اس کے ساتھ حکومت الٰہیہ کے قیام کی کوشش بھی ضرور کرے تاکہ اس کے ذریعہ دین کو پورے طور پر قائم کیا جاسکے۔ یہ المیہ ہی ہے کہ بہت سے اہل ایمان دین اسلام کا قیام چاہتے ہیں لیکن اس کیلئے حکومت الٰہیہ کے قیام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے جبکہ دین اسلام کا قیام حکومت الٰہیہ کے قیام سے جڑا ہوا ہے۔

اسلام میں حکومت الٰہیہ کی کتنی زیادہ اہمیت ہے اللہ کے ایک فرمان سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ پر ہجرت کے وقت نازل فرمایا تھا چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ وقل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا (بنی اسرائیل ۸۰)

ترجمہ: اور (اے محمدؐ) کہہ اے میرے رب داخل کر مجھکو سچائی کے ساتھ داخل کرنا اور نکال مجھکو سچائی کے ساتھ نکالنا اور عطا کر مجھکو اپنے پاس سے حکومت کی مدد)

مذکورہ آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فاضل دیوبند نے جو کلمات تحریر فرمائے وہ ملاحظہ ہوں۔ (یعنی غلبہ اور تسلط عنایت فرما جس کے ساتھ تیری مدد و نصرت ہو۔ تاکہ حق کا بول بالا رہے اور معاندین ذلیل و

پست ہوں۔ دنیا میں کوئی قانون ہو سماوی یا ارضی اس کے نفاذ کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے کہ حکومت کی مدد ہو۔ جو لوگ دلائل و براہین سے اور آفتاب کی طرح حق واضح ہو چکنے کے بعد بھی ضد و عناد پر قائم رہیں ان کے شر و فساد کو حکومت کی مدد ہی روک سکتی ہے۔ (منقول مترجم شیخ الہند صفحہ نمبر ۳۸۵)

حکومت الٰہیہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا اہمیت ہوگی کہ اللہ نے اپنے آخری کلام میں آخری نبی کو اس کے حصول کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حکومت الٰہیہ کے حصول کی دعا اور اس کے قیام کے لئے جد و جہد بہت عظیم و مبارک عمل ہے۔ اس لحاظ سے بڑے مبارک ہیں وہ اہل ایمان جو اس کے قیام کے لئے اپنا خون و پسینہ بہا رہے ہیں۔ لیکن یہ المیہ ہی ہے کہ آج کچھ ایمان والے حکومت الٰہیہ کے قیام کو دعویٰ محض قرار دے کر اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار کرتے ہیں، اور ستم ظریفی یہ کہ جو اہل ایمان حکومت الٰہیہ کے قیام کی جد و جہد میں مصروف ہیں انہیں دنیادار کہہ کر ان پر لعنت و ملامت کرتے ہیں۔

برصغیر ہند و پاک کے فکری و علمی رہنما شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریر سے بھی حکومت الٰہیہ کی اہمیت و ضرورت اچھی طرح واضح ہوتی ہے جو آپ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔ اعلم انه يجب ان يكون في جماعة المسلمين خليفة لمصالح لاتتم الا بوجوده و هي كثيرة جدا يجمعها صنفان: احدهما ما يرجع الى سياسة المدينة من ذب الجنود التي تغزوهم و تقهرهم و كف الظالم عن المظلوم و فصل القضايا و غير ذالك و قد شرحنا هذه الحاجات من قبل. و ثانيهما ما يرجع الى الملة و ذلك ان تنويه الدين الاسلام على سائر الاديان لا يتصور الا بان يكون في المسلمين خليفة ينكر على من خرج من الملة و ارتكب ما نصت على تحريمه او ترك ما نصت على افتراضه اشد الانكار و يذل اهل سائر الاديان و يأخذ منهم الجزية عن يد و هم صاغرون و الاكانوا متساويتي المرتبة لا يظهر فيهم الرجحان احدا الفريقين علي الاخرى و لم يكن كابح يكبحهم عن عدوانهم. (حجة الله البالغة. جلد نمبر ۲ صفحه نمبر ۳۷)

ترجمہ: جان لے کہ مسلمانوں کی جماعت میں کئی مصلحتوں کی وجہ سے ایک خلیفہ ہونا واجب ہے کہ اس کی موجودگی کے بغیر یہ مصلحتیں پوری نہیں ہو سکتیں اور یہ مصلحتیں کئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جو کہ شہری سیاست کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی افواج کا دفاع کرنا جو کہ کافروں سے جنگ کریں اور ان کو

مغلوب کریں اور ظالم کو ظلم سے روکنا اور جھگڑے چکانا وغیرہ ہم ان حاجات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ مصلحتوں کی دوسری قسم وہ ہے جو ملت کی طرف لوٹتی ہے اور وہ یہ کہ دین اسلام کا دوسرے ادیان پر عظمت ظاہر کرنا اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ مسلمانوں میں ایک خلیفہ ہو جو ملت سے خروج و بغاوت کرنے والے کو روکے۔ دین میں جس کو حرام قرار دیا گیا ہے اس کے ارتکاب کرنے والے پر سختی کرے، اور جس کو فرض قرار دیا گیا ہے اس کے چھوڑنے والے پر سختی سے باز پرس کرے۔ دوسرے تمام ادیان کو نیچا دکھائے اور ان سے جزیہ وصول کرے اور وہ ذلیل ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کافر و مسلم درجہ میں برابر ہو جائیں گے اور ان دونوں فرقوں میں سے کسی ایک کی ترجیح و فضیلت ظاہر نہ ہوگی اور نہ انہیں کوئی سرکشی سے روکنے والا ہوگا۔

یہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ شاہ ولی اللہ کی مذکورہ تحریر میں جس خلیفہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ خلیفہ نہیں ہے جس کا تصور بعض دینی حلقوں میں اپنی ذاتی اصلاح و تربیت کیلئے کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا پایا جاتا ہے اور جو اسلامی نظام کے قیام کی طاقت و قوت سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ بلکہ مذکورہ تحریر میں جس خلیفہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ خلیفہ ہے جس کے پاس اسلامی نظام کو قائم کرنے اور باطل نظام کو مٹانے کی طاقت و قوت ہو، جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے مذکورہ تحریر میں خلیفہ کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ شہری سیاست کا انتظام سنبھالے اور افواج کا انتظام کرے جو کافروں سے جنگ کریں اور ان کو مغلوب کریں۔ ظالم کو ظلم سے روکے۔ جھگڑوں کا فیصلہ چکائے اور دین اسلام کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کرے۔ وغیرہ لیکن یہ المیہ ہی ہے کہ کچھ حضرات اپنی ذاتی اصلاح و تربیت کیلئے کسی کو اپنا خلیفہ بنا کر اسی پر مطمئن و قانع ہیں اور سمجھتے ہیں ہم نے خلافت سے جڑنے کا حق ادا کر دیا۔ جبکہ شرعی طور سے یہ عمل خلافت سے جڑنے کی تعریف میں آتا ہی نہیں۔

حکومت الٰہیہ کی اہمیت و ضرورت ماضی قریب کے ایک مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تحریر سے بھی اچھی طرح واضح ہوتی ہے جو آپ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب سیرت سید احمد شہید میں تحریر فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے چند اقتباسات کی عبارت قارئین کی خدمت میں من و عن پیش ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ کی بعثت کا ایک اہم مقصد انسانوں پر اللہ کی حکومت و شریعت کو قائم کرنا، زمین میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا، چنانچہ اس کے تاریخ اور تیرہویں صدی کے امیر المومنین کی زندگی میں اتباع نبوی کی بہ حیثیت

نمایاں نظر آئے گی اور اسی چیز نے مشائخ امت میں اس جوان کا سر اونچا کر دیا ہے۔ مصلحین اور علماء و مشائخ نے بے شبہ اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اور دے رہے ہیں، ہزاروں بندگان خدا کو ان سے ہدایت ہوئی ہزاروں کو ان کی وجہ سے کلمہ نصیب ہوا، ہزاروں کے قافلے کھنچے ہوئے، آج بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیض ان سے جاری ہے لیکن ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس نقطہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام حیات و قوانین وحدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپ اسی نقشے پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے کیا، اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائیدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظام عمل ہے۔ اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں، اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں، اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں، وہ پوری زندگی کا نظام ہے، وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے، اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف اسی کو قانون سازی و تنفیذ کا حق ہو، اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لئے نمونہ ہوں، اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے، اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر و للہ عاقبۃ الامور (۲۲:۴۱)

یہ مظلوم مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایک نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا، اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے، جو حکومت پر موقوف ہے، حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے، خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن غلبہ و قوت کے حصول پر زور دیتا ہے، اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی، اور اسی کو کبار صحابہ نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا، جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسین نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور وہ نااہل ہاتھوں میں جانے نہ پائے "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ امت کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (۳-۱۱۰) تم بہترین قوم ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اور قیامت تک کے لئے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (۳-۱۰۴)

تم میں ایک ایسی جماعت رہنی چاہئے جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی رہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لئے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے الفاظ میں حقیقتاً تحکم کی شان ہے، یعنی قوت یہ کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کے لئے درخواست و عرض کریں گے، بلکہ امر و نہی کے لئے بھی اقتدار و بالادستی کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔

حضور کی مشہور حدیث ہے:

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان

تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے ہاتھ سے روک دے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی قدرت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ آخری درجہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

ظاہر ہے کہ "تغییر بالید" (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لئے قوت و اقتدار کی ضرورت ہے، زبان سے روکنے کے لئے قوت و اختیار کی ضرورت ہے، اگر یہ بھی نہیں تو تیسرے درجہ پر قناعت کرنی پڑے گی، جو ایمان کا آخری درجہ ہے، اور جس کے بعد بعض روایات کے مطابق ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا، مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ برائی میں دل سے برا سمجھنا اور نفرت رکھنے کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔ (منقول سیرت سید احمد شہید حصہ اول صفحہ ۵۲۔۵۹)

حضرت مولانا علی میاں ندوی کی مذکورہ تحریر سے یہ بات، اس وقت کی طرح عیاں ہو گئی کہ امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے کے لئے سیاسی اقتدار ضروری ہے اور یہ سیاسی اقتدار حکومت الٰہیہ کے ذریعہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی کہ جو ایمان والے حکومت الٰہیہ کے بغیر لوگوں کے سامنے معروف و منکر کو بیان کرتے ہیں یا معروف کے اختیار کرنے اور منکر سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کا یہ عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زمرے میں نہیں آتا کیونکہ اس حکم کے ساتھ نفاذ کی طاقت نہ ہو اسے حکم نہیں کہتے بلکہ درخواست یا عرض کہیں گے۔ اور اللہ نے معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا حکم دیا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب حکومت الٰہیہ کا قیام ہو۔

لیکن یہ المیہ ہی ہے کہ کچھ مسلمان لوگوں کے سامنے معروف و منکر کو بیان کر کے یا معروف کے اختیار کرنے اور منکر سے بچنے کی تلقین کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کر دیا۔

حکومت الٰہیہ کے بغیر لوگوں کو اسلام کی دعوت تو دی جا سکتی ہے اور ضرور دی جانی چاہئے۔ لیکن یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو صرف اسلام کی دعوت کے لئے پیدا نہیں کیا، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا مقصد وجود قرار دیا۔ اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی دعوت میں مقبولیت و عمومیت بھی حکومت الٰہیہ کے غلبہ کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے آنحضورؐ کی نبوی زندگی کے دونوں دور کے فرق پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہے۔ آنحضورؐ کا دور مکی جو تیرہ سال پر مشتمل ہے، یہ دعوتی دور کہلاتا ہے، ساتھ ہی یہ حکومت الٰہیہ کی مغلوبیت کا دور شمار ہوتا ہے۔ ان تیرہ سالوں میں آپؐ نے مسلسل لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان تیرہ سالوں میں آپ کی دعوت کے نتیجہ میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے ان کی تعداد چار، پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اور بے ثباتی کا یہ عالم کہ جو شہر اس دعوت کا مرکز تھا یعنی مکہ خود اس شہر کے رہنے والے اہل ایمان کو اپنے گھروں میں رہنا دوبھر ہو گیا اور انہیں ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا۔

اس کے برخلاف دور مدنی کو دیکھئے جو دس سال پر مشتمل ہے، یہ دور حکومت الٰہیہ کے غلبہ کا دور شمار ہوتا ہے۔ اور اس کا مرکز شہر مدینہ تھا جو تمام اہل ایمان کے لئے پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ اس دور کی دعوتی عمومیت کے لئے یہ کافی ہے کہ دس سال کے اندر اندر تقریباً پورے عرب پر حکومت الٰہیہ قائم ہو چکی تھی۔ اور جب آنحضورؐ نے دس سال کے بعد اپنا آخری حج ادا کیا تو آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ لاکھ اہل ایمان کا

مجمع تھا جو آپؐ کے ایک اشارہ پر اپنی جان دینا زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ دعوت کی یہ مقبولیت و عمومیت دراصل حکومت الٰہیہ کے غلبہ کا نتیجہ تھی۔

دور مکی اور دور مدنی کے اس فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ کہاں تیرہ سالہ محنت کا نتیجہ چار پانچ سو افراد کا اسلام میں داخل ہونا اور کہاں دس سالہ محنت کا نتیجہ کہ لاکھوں افراد کا اسلام میں داخل ہونا۔ اسی حقیقت کو اللہ نے قرآن میں یوں بیان فرمایا: "اذا جاء نصر اللہ والفتح و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا۔ فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا"۔ (نصر)

ترجمہ: "جب آ چکے اللہ کی مدد اور فتح اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے دین میں غول غول تو پاکی بیان کر اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اور مغفرت چاہ بیشک وہ معاف کرنے والا ہے"۔

مذکورہ سورہ میں لوگوں کے جوق در جوق دین میں داخل ہونے کا اہم سبب اللہ کی مدد اور فتح کو قرار دیا، اور اللہ کی مدد بھی دراصل دین کی مدد کرنے پر آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام لوگوں کے دین میں جو داخل ہونے اور دین کی طرف متوجہ ہونے کا اہم سبب اسلام کا سیاسی غلبہ ہے۔ اسلام کے سیاسی غلبہ کے بغیر عام لوگوں کو دین کی طرف متوجہ نہیں کیا جا سکتا لیکن بدقسمتی سے آج کچھ اہل ایمان یہ تصور رکھتے ہیں کہ پہلے تمام لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کر دیا جائے بعد میں اسلام کے سیاسی غلبہ کی کوشش کی جائے جبکہ یہ ناممکن ہے۔

لیکن کسی کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اہل ایمان کی جو بھی جماعت اسلام کے سیاسی غلبہ کے لئے اٹھے اسکے لئے مظلومیت و مغلوبیت کے دور سے گذرنا ناگزیر ہے۔ لیکن بہت فرق ہے مظلومیت، مغلوبیت سے گذرنے اور مظلومیت و مغلوبیت کو قبول کرنے میں۔ آج زیادہ تر اہل ایمان نے مظلومیت و مغلوبیت کو قبول کر لیا اور اسی پر راضی اور مطمئن ہیں، اور اس مغلوبیت کو غلبہ سے بدلنے کی کوئی سنجیدہ اور منظم کوشش نہیں ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ بہت سے اہل ایمان اسلام کے سیاسی غلبہ کی کوشش کو دینی کوشش سمجھتے ہی نہیں، جبکہ یہ عین دینی کوشش ہے۔ اس حقیقت کو مولانا علی میاں ندوی نے اپنی کتاب: سیرت سید احمد شہید میں یوں تحریر فرمایا (اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی راستہ عمل ہے، جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے اور وہ وہی ہے جس کے مطابق جناب رسول ﷺ، آپ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین امت نے عمل کیا، یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی و روحانی، مادی، سیاسی غلبہ کی کوشش کرنا۔

اسی طرح سے مسلمانوں کی منزل مقصود کا بھی ایک راستہ ہے، وہ وہی راستہ ہے جس سے

امت کا پہلا قافلہ منزل تک پہنچا ہے" لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا ما اصلح اولہا" اس امت کے پچھلوں کی اصلاح صرف وہی چیز کر سکتی ہے جس نے اس کے اگلوں کی اصلاح کی تھی، یعنی دین خالص اور اس کی پیروی۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ صفحہ ۴۳)

مولانا علی میاں ندوی کی مذکورہ تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آنحضورؐ کے دور میں اہل ایمان کی تعلیم و تربیت کا جو ذریعہ تھا وہی ذریعہ قیامت تک کے آنے والے اہل ایمان کے لئے رہے گا، اسی طرح آنحضورؐ کے دور میں دین کے کام کرنے کا جو طریقہ تھا وہی طریقہ قیامت تک کے آنے والے ایمان والوں کے رہے گا۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آنحضورؐ کے دور میں اہل ایمان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ صرف قرآن اور آپؐ کے ارشادات تھے، اور دین کے کام کرنے کا طریقہ کفار، مشرکین، اور یہود و نصاریٰ کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنا اور اسلام کے سیاسی غلبہ کے لئے دشمنان اسلام سے جنگ کرنا تھا۔ لیکن یہ المیہ ہی ہے کہ آج بہت سے ایمان والے اہل ایمان کی تعلیم و تربیت کے لئے قرآن کی تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور نہ کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ اسلام کے سیاسی غلبہ کے لئے دشمنان اسلام سے جنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

حکومت الٰہیہ کی اہمیت تیرھویں صدی ہجری کے مجاہد اسلام سید احمد شہیدؒ کے ایک فرمان سے بھی اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ اس فرمان کو مولانا علی میاں ندوی نے اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" میں متن و ترجمہ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے چنانچہ اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ (دین کا قیام سلطنت سے ہے اور دینی انتظام کا تعلق حکومت سے ہے۔ سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کام میں خرابی اور پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام ملک سے ذات و عزت اور شریعت مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کے معابد اور مساجد کی جو تخریب ہوتی ہے وہ بخوبی ظاہر ہے۔) (سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول صفحہ ۲۲۲)

آنحضورﷺ کی ایک حدیث سے بھی حکومت الٰہیہ کی اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے چنانچہ فرمان رسول ہے: عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبیﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرتے تھے، جب ان میں سے کسی نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کا جانشین بن جاتا، اور میرے بعد کوئی

نبی نہیں، اور عنقریب خلفاء ہوں گے، اور بہت زیادہ ہوں گے۔

مذکورہ حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ امت مسلمہ کی قیادت، سیاست، خلافت سے جڑی ہوئی ہے اس لئے امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خلافت کے قیام کی کوشش کرے۔ خلافت کے قیام کے بغیر امت مسلمہ کی قیادت صحیح نہیں ہو سکتی لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ آج بہت سے مسلمان خلافت کے قیام کی کوشش کرنے کے بجائے غیر اسلامی سیاست کے قیام، بقا کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

حکومت الٰہیہ کی اہمیت و ضرورت علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر سے بھی اچھی طرح واضح ہوتی ہے جو آپ علیہ نے اپنی کتاب سیرت النبی کی ساتویں جلد میں تحریر فرمایا چنانچہ وہ تحریر قارئین کی خدمت میں من وعن پیش ہے۔

(کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضہ ہے۔ اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جا سکتی جو کسی سردار کے بغیر، جو بھی آئی ہو۔ انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اسکی زبان کا ہر حکم قانون تھا۔ جب خاندان نے جماعت کا روپ دھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا۔

(منقول سیرت النبیؐ جلد ہفتم صفحہ ۹۷)

بحث ونظر

میراث، حقوق ملکیت اور عورتوں کا مالی تحفظ

ایک تقابلی مطالعہ

تحقیق: اے، ایچ نعمانی، اسلامک ریسرچ سنٹر لکھنؤ

ترجمہ: فلک ظہیر، جامعۃ الفلاح

میت کی قانونی ملکیت کے اس کی اولاد میں تقسیم ہونے کو میراث کہتے ہیں۔ اعزہ واقارب میں تقسیم جائیداد کا تناسب یا مناسب مقدار کا تعین بڑا دشوار کام ہے۔ چینی فلسفی کنفیوشش کے نظریہ کے مطابق دوسرے بہت سے مذاہب کی طرح سب سے بڑا لڑکا ہی باپ کی مکمل جائیداد پر تصرف کا حق رکھتا ہے۔ جسے Primogeniture (جیٹھائی) کہتے ہیں۔ دنیا بھر میں رائج دوسرے مروجہ نظام معمولی فرق کے ساتھ عورتوں کے سلسلہ میں بہت زیادہ تنگ نظری کا شکار ہیں۔

امریکانہ انسائیکلوپیڈیا کے مطابق برطانیہ کے روایتی قانون میں وہ اصل جائیداد جو عورت کی ملکیت ہوتی تھی شادی ہوتے ہی وہ شوہر کی ملکیت بن جاتی تھی۔ اس جائیداد سے حاصل ہونے والے ہر فائدے اور لگان کا اسے ہی مستحق قرار دیا جاتا تھا۔ ۱۸۷۰ء تک یورپ میں شادی شدہ عورت کو معاہدوں میں شریک ہونے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی اسے نجی جائیداد رکھنے کا حق حاصل تھا۔ فرانس میں یہ حق ۱۹۳۸ء میں تسلیم کیا گیا۔

زمانہ قدیم میں وراثت میں عورت کو کچھ بھی حق حاصل نہ تھا حتیٰ کہ اگر ترکہ کبھی اس کے ہاتھ لگ بھی جاتا تو اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ قانون کی رو سے وہ کسی آزاد شخصیت کی مالک نہ تھی۔ بعض مخصوص قدیم قانونی نظام کے مطابق لڑکی وارث بن سکتی تھی مگر اس کی اولاد نہیں، دوسری طرف لڑکا نہ صرف خود وارث بنتا تھا بلکہ اس کے بچے بھی اپنے دادا کی متروکہ جائیداد میں حصہ دار ہوتے تھے۔ بعض دیگر نظام قانون نے عورت کو وراثت میں حصہ دار تسلیم کیا مگر متعین طور سے اس کا حصہ واضح نہیں کیا یعنی بزبان قرآن ''نصیبا مفروضا'' کی حیثیت نہیں دی انھوں نے سادے انداز سے

اختیاری طور پر مورث کو عورت کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

مورخین و محققین نے زمانہ قدیم میں رائج مختلف قوانین وراثت کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے ہمیں ان تفصیلات سے تعرض کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہمارے مقصد کے حصول کے لئے مذکورہ بالا خلاصہ ہی کافی ہے۔

وراثت سے عورت کی حرماں نصیبی کی بنیادی وجہ دولت کے ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہونے سے گریز تھا۔ قدیم عقائد کے مطابق افزائش نسل میں عورت کا کردار کسی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ عورتیں صرف اس مشین کی طرح خدمت انجام دیتی تھیں جہاں مردوں کے نطفے ارتقائی مراحل طے کرکے بچے کی شکل میں نمودار ہوتے تھے۔ اس بنیاد پر ان کا یقین تھا کہ آدمی کے لڑکے کی اولاد اس کی اپنی اولاد ہے اور اس کے خاندان کا جزو ہے اور آدمی کی بیٹی کے بچے اس کے خاندان کے فرد نہیں کیوں کہ وہ اپنے دادا کے خاندان کے فرد ہیں۔ اس طرح اگر لڑکی کو وراثت مل بھی جاتی تو اس کا مطلب جائیداد کو اپنے بچوں کے حوالے کرنا لیا جاتا۔

مرحوم موسیٰ عمید کہتے ہیں ''پرانے زمانے میں خاندان کی تشکیل کی بنیاد مذہب ہی ہوا کرتا تھا کوئی فطری رشتہ نہیں۔ دادا بچوں اور پوتوں کا سماجی مکھیا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا مذہبی پیشوا بھی ہوا کرتا تھا۔ مذہبی رسوم ورواج کا انتظام صرف اولاد نرینہ کے توسط سے آنے والی نسلوں کے حوالے ہوتا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں نے صرف مرد کو ہی باقی ماندہ نسلوں کا ذریعہ تسلیم کیا۔ خاندان کا باپ نہ صرف اپنے بیٹے کو وجود بخشتا تھا بلکہ اپنے مذہبی عقائد اور رسم ورواج کو بھی اس تک منتقل کرتا تھا۔ ہندوؤں، یونانیوں، اور رومیوں کے قانون کے مطابق افزائش نسل کی قوت صرف مردوں تک محدود ہے یہیں سے خاندانی مذاہب میں مردوں کی اجارہ داری ہوگئی۔ مذہبی معاملات میں عورتوں کا کوئی دخل نہ تھا البتہ والد یا شوہر کے توسط سے وہ ان میں بالواسطہ شریک ہوسکتی تھیں۔ چونکہ مذہبی رسومات کی انجام دہی میں وہ کوئی رول ادا نہیں کرسکتی تھیں اس لئے فطری طور پر انھیں تمام خاندانی مراعات سے محروم رکھا جاتا۔ تبھی تو نظام وراثت کے وجود میں آنے پر انھیں وراثت سے خارج کردیا گیا۔

وراثت سے عورت کو خارج کرنے کے اور بھی اسباب ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اچھی فوجی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ اس معاشرہ میں جہاں عظمت وبڑائی کا تعلق مردانگی اور

بہادری کے کارنامے سرانجام دینے کی طاقت اور ایک جنگ جو لاکھوں غیر جنگ جو افراد پر فوقیت حاصل ہو وہاں عورت کو وراثت کے حقوق سے محروم رکھا گیا اس لئے کہ جنگی صلاحیتوں سے محروم تھی۔

اس مخصوص سبب کے باعث اسلام سے پہلے اہل عرب عورتوں کو وارث بنائے جانے کی مخالفت کرتے تھے جو خاندان کے مرد کی زندگی میں خواہ وہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، وارث نہیں بن سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اس وقت بڑا تعجب ہوا جب قرآن نے دوٹوک انداز میں اعلان کیا کہ "والدین اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور والدین اور رشتہ داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ ایک متعین حصہ ہے۔ (النساء:۷)

مشہور صحابی اور شاعر دربار رسول ﷺ حسان بن ثابتؓ کے بھائی انھیں دنوں ایک بیوی اور کئی بیٹیوں کو چھوڑ کر چل بسے۔ ان کے چچازاد بھائی ان کی تمام جائیداد پر قابض ہو گئے ان کی بیوہ اور بیٹیوں کو کچھ بھی نہ دیا۔ بیوہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے اس کے مرحوم شوہر کے چچازاد بھائیوں کو طلب کیا۔ انھوں نے کہا کہ عورت اسلحہ اٹھانے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، یہ تو مردوں ہی کے بس کی بات ہے۔ مردوں نے ہی خود اپنی اور عورت کی حفاظت کی اور ان کا دفاع کیا ہے اس لئے وہی تنہا جائیداد کے وارث بننے کا حق رکھتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے انھیں اس فرمان الٰہی سے انھیں آگاہ فرمایا جس کی وضاحت مذکورہ بالا آیت میں کی گئی ہے۔

اسلام میں عورت کا حق وراثت

اسلامی قانون وراثت گذشتہ تمام نقائص اور خامیوں سے پاک ہے۔ مساوات مرد و زن کا دعویٰ کرنے والوں کی نگاہوں میں واحد قابل اعتراض بات یہ ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق بیٹے کو بیٹی کا دوگنا حصہ ملتا ہے۔ بھائی کو بہن کا دوگنا، شوہر کو بیوی کا دوگنا۔ صرف ماں اور باپ کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

اگر میت کے بچے ہیں اور والدین بھی باحیات ہیں تو ماں اور باپ دونوں کو الگ الگ اس کی متروکہ جائیداد کا چھٹا حصہ ملے گا۔ مہر، اخراجات اور فوجی خدمت اور کچھ مجرمانہ قوانین کے مدنظر عورت کی مخصوص صورت حال کی وجہ سے عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف متعین کیا گیا۔

مذکورہ اسباب کی وجہ سے اسلام مہر اور نان و نفقہ کو ازدواجی تعلقات کے استحکام کے سلسلہ میں ضروری اور موثر تسلیم کرتا ہے۔ یہ خانگی ہم آہنگی اور اتحاد کو یقینی بناتا ہے۔ ان کا خاتمہ خاندانی ساخت کو تقریباً ہلا ڈالتا ہے اور عورت کو عصمت فروشی پر مجبور کرتا ہے۔ مہر اور نان و نفقہ کی ذمہ داری کے واجب ہونے کی وجہ سے عورت معاشی ذمہ داری سے فارغ کر دی گئی ہے اور آدمی کا بوجھ متناسب انداز سے بڑھ گیا ہے۔ مرد کے اضافی بوجھ کی تلافی کے لئے وراثت میں اس کا حصہ عورت کے حصہ کا دوگنا متعین کیا گیا ہے اور مہر اور نان و نفقہ نے عورت کے حصہ کو کم کر دیا ہے۔

مستشرقین کا اعتراض

کچھ مستشرقین وراثت میں عورت کا حصہ کم ہونے پر تنقید کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف بطور ہتھیار اس کا استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وراثت میں عورت کا حصہ کم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور مہر و نان و نفقہ کی رخصت سے ہونے والے نقصان سے اس کی تلافی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ غیر مانوس گلیوں کی کوچہ گردی اور اجنبی راہوں کی رونوردی کی کیا ضرورت ہے؟ ابتدا ہی سے عورت کا حصہ مرد کے برابر کیوں نہیں رہا کہ ہمیں اس کے مہر اور نان و نفقہ کی اجازت سے اس کی تلافی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

سادہ لوح افراد جو بادشاہ سے بڑھ کر ملوکیت پسند ہیں انھوں نے نتیجہ کے سبب اور سبب کا نتیجہ سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ انھوں نے سوچا کہ مہر اور نان و نفقہ وراثت کے تعلق سے عورت کی مخصوص صورت حال کا نتیجہ ہیں جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مزید برآں وہ اس بات کے زیر اثر ہیں کہ معاشی پہلو واحد معاوضہ ہے اگر یہی واحد معاوضہ رہتا تو بدیہی طور پر نہ تو مہر اور نان و نفقہ کے نظام کی کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی عورتوں اور مردوں کے حصہ میں فرق ہوتا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اسلام نے بہت سے پہلوؤں پر بحث کی ہے ان میں سے کچھ فطری ہیں اور کچھ نفسیاتی۔ اس نے افزائش نسل سے پیدا ہونے والی عورت کی مخصوص ضروریات پر غور کیا ہے۔ آدمی کو فطرتاً ان اشیا کی کوئی احتیاج نہیں۔ ساتھ ہی ایک طرف تو عورت کی کسب معاش کی استطاعت مردوں سے کمتر ہے دوسری طرف اس کے اخراجات زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے دوسرے عمدہ پہلو بھی ہیں جو اپنے لئے عقلی دلیل رکھتے ہیں۔ مثلاً آدمی اپنی من پسند عورت کی خاطر ہمہ آن خرچ کرنے کے لئے تیار رہتا

ہے۔ دوسرے سماجی اور نفسیاتی پہلو بھی ہیں جو خانگی رشتوں کے استحکام کے لئے معاون ہیں۔ ان باتوں سے بھی قرآن نے بحث کی ہے۔ ان تمام نکات کو خیال میں رکھتے ہوئے اسلام نے مہر اور نان و نفقہ کو فرض گردانا ہے۔ اس طرح سے یہ محض معاشی سوال نہیں ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے حصہ کو ایک مقام پر کم کرنے اور کہیں اور اس کی تلافی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ابتدائے اسلام میں کفار کا اعتراض

ہم واضح کر چکے ہیں کہ مہر اور نان و نفقہ عورت ہیں اور وراثت کے تعلق سے عورت کی مخصوص حالت اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ نکتہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ یہ تو اسلام کے ابتدائی ایام ہی میں محقق ہو چکا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں ابن ابی العوجاء نامی شخص تھا جس کا مذہب پر اعتقاد نہ تھا اس دور کی مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے ملحدانہ خیالات کا برملا اظہار کرتا پھرتا بسا اوقات وہ مکہ میں خانۂ کعبہ میں اور مدینہ میں مسجد نبوی میں بھی آتا تھا اور اس وقت کے علماء سے اسلام کے اصولوں پر مناظرے کرتا تھا۔ اسلام کے خلاف اس کے اعتراضات میں سے ایک وراثت سے متعلق تھا وہ کہا کرتا تھا "بیچاری عورت کا کیا قصور ہے کہ وہ ایک حصہ پاتی ہے جبکہ آدمی دوگنا پاتا ہے۔" اس کے نزدیک یہ عورت کے ساتھ ظلم تھا۔ اس کے جواب میں امام جعفر صادقؑ فرماتے تھے ایسا اس لئے ہے کیوں کہ عورت کو فوجی خدمات کی انجام دہی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام نے عورت کے نان و نفقہ اور مہر کی ادائیگی کو مرد پر لازم قرار دیا ہے اور مخصوص مجرمانہ مقدمات میں جہاں مجرم کے اقرباء کو قصاص کی ادائیگی میں شرکت کرنی پڑتی ہے وہاں عورت کو اس قسم کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر اس کا حصہ کم ہے۔ اس طرح امام صادقؑ نے واضح طور سے وراثت کے تعلق سے عورت کی مخصوص حالت کو اس قانون کے وجود کا سبب قرار دیا ہے جو مہر، نان و نفقہ، فوجی خدمت سے انقطاع اور قصاص کی ادائیگی سے استثنا کو تسلیم کرتا ہے۔

ابی ایچ سن نے بابلیل کا نظریہ مختصراً پیش کیا ہے۔ بابلیل کے زمانہ سے مسلسل رائج قانون خاندان کی عورتوں، بیوی اور بیٹی کا خاندان کی جائیداد میں کوئی حق تسلیم نہیں کرتا۔ اس سے بھی قدیم وراثت کے خاکہ میں خاندان کی عورتوں کو جائیداد کا حصہ سمجھا جاتا تھا اور غلام کی طرح قانونی وارث

بنا بعید از قیاس بات تھی۔ جبکہ موزیک کی قانون سازی کے ذریعہ بیٹیوں کو اولاد نرینہ کی غیر موجودگی میں وارث تسلیم کر لیا گیا پھر بھی بیوی ان صورتوں میں بھی وارث تسلیم نہ کی گئی۔ خاندان کی عورتوں کو خاندان کی جائیداد کا حصہ کیوں سمجھا گیا؟ ابی ایچ سن اس کا جواب یوں دیتے ہیں "وہ شادی سے پہلے باپ کی ملکیت ہوتی ہیں اور شادی کے بعد شوہر کی۔"

بابلیل کے قوانین میراث (۱۱: ۲۷) میں پیش کئے گئے ہیں۔ بیوی کو شوہر کی جائیداد میں کوئی حق نہیں دیا گیا ہے۔ جبکہ وہ اپنی بیوی کا اولین وارث ہے حتیٰ کہ اس کے بچوں سے پہلے۔ بیٹی اسی وقت وارث بن سکتی ہے جب کوئی وارث مرد موجود نہ ہو۔ ماں کو قطعی طور پر حصہ نہیں ملے گا جبکہ باپ کو ملے گا۔ بیوہ اور بیٹیاں اولاد نرینہ کی موجودگی میں مرد وارثوں کے رحم و کرم پر ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے بیوہ اور یتیم لڑکیاں یہودی معاشرہ میں سب سے قلاش ہوا کرتی تھیں۔

عیسائیت نے طویل عرصہ تک ایسا ہی کیا۔ عیسائیت کے کلیسائی اور ملکی دونوں ہی قوانین نے بیٹیوں کو میراث پدری میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مشارکت سے محروم کر دیا۔ ساتھ ہی بیویوں کو کسی بھی طرح کے حق وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ غیر منصفانہ قوانین گذشتہ صدی کے اواخر تک برقرار رہے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی عورتیں بذات خود سامان وراثت ہی ہوتی تھیں اور انہیں مرد کی جائیداد کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ کی اس نازک صورت حال کے دور میں اسلام نے انسانی فکر کے میدان میں نیز عورتوں سے متعلق نقطۂ نگاہ کو ترقی بخشی اور وراثت کو دیانت داری کے ساتھ تقسیم کر کے بیک وقت عورتوں کو وراثت کے حقوق عطا کئے یہ متعین حصہ خود اللہ تعالیٰ کا متعین کردہ ہے اور اس میں سرمو تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ "ہم نے رشتہ داروں اور والدین کی متروکہ جائیداد کے وارث اور حصے متعین کر دیئے ہیں۔" (نساء: ۳۳) اسلامی قانون وراثت انتہائی واضح ہے اور اس کی بنیاد دو امتیازی خصوصیات پر ہے۔

۱۔ حصہ کی حد کا انحصار وارثوں کے میت سے رشتہ کی قرابت پر ہے۔ "باہم خونی رشتے اللہ کی کتاب میں زیادہ قریبی بندھن ہیں مہاجرین اور مومنین کی مواخاۃ کے مقابلہ میں۔" (احزاب: ۶) ایک اور آیت میں ہے "جو کچھ والدین اور اقارب نے چھوڑا ہے اس میں مرد کا ایک حصہ ہے اور ایک

عورت کا۔ خواہ جائیداد اہیر ہو یا کثیر۔ ایک متعین حصہ ہے۔ (نساء:۷)

"اکثر حالات میں آدمی کا حق میراث عورت کے حصہ کا دوگنا ہے۔" اور اس طرح تمہیں تمہارے بچوں کی وراثت کے سلسلہ میں مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر کا حصہ ہے۔ اگر ایک بیٹی، دو یا زیادہ ہوں تو ان کا حصہ ترکہ کا دو تہائی ہوگا۔ اگر ایک ہی بیٹی ہے تو نصف ہوگا۔ (نساء:۱۱)

درحقیقت یہ خاندان اور رشتہ داروں کے تعلق سے مرد پر عائد ہونے والی مختلف معاشی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہے۔ مزید براں تعجب خیز بات ہے کہ قرآن میں بارہ افراد کو وراثت کے سلسلہ میں ذوی الفروض (متعین حصہ والے) کی حیثیت دی گئی ہے جہاں صرف چار مرد ہیں اور بقیہ آٹھ عورتیں ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ اسلام نے عورتوں کے حصہ کی یقین دہانی کے بارے میں انتہائی سنجیدگی کا اظہار کیا ہے جو اسلام کی بعثت سے قبل انتہائی حرماں نصیبی کے عالم میں تھیں۔ اسلام نے بیٹی کا حصہ متعین کر دیا ہے جیسا کہ وہ ذوی الفروض کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر بیٹے کا حصہ متعین نہیں کیا ہے کیوں کہ اس کی حیثیت عصبہ کی ہے۔

مسلم ماؤں، بیویوں، بیٹیوں، اور بہنوں نے یورپ کے ان حقوق کو تسلیم کرنے سے تیرہ سو سال پہلے حق وراثت پا لیا تھا۔ تقسیم میراث ایک وسیع مضمون ہے جس کی تفصیلات بہت زیادہ ہیں۔ (۴:۷، ۱۱، ۱۲، ۱۷۶) عام قاعدہ یہ ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہوتا ہے سوائے ان صورتوں کے جہاں ماں باپ کے حصہ کے برابر پاتی ہے۔ اس عام قاعدے کو اگر مردوں اور عورتوں سے متعلق دیگر قوانین سے الگ تسلیم کیا جائے تو غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس قانون کے پس منظر کا سبب معلوم کرنے کے لئے ہمیں یہ حقیقت جان لینی چاہئے کہ اسلام میں مردوں کی معاشی ذمہ داریاں عورتوں کی ذمہ داریوں سے بہت ہی زیادہ ہیں۔ دولہے کو اپنی بیوی کو شادی کا تحفہ (مہر) دینا پڑتا ہے اور یہ تحفہ عورت کی مخصوص ملکیت بن جاتا ہے اور طلاق ہو جانے کے بعد بھی اس کی ملکیت بحال رہتی ہے۔ دلہن پر اپنے شوہر کو کسی قسم کا تحفہ پیش کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مزید براں مسلم شوہر سے بیوی اور بچوں کے اخراجات وصول کئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف عورت اس تعلق سے مرد کا تعاون کرنے پر مجبور نہیں کی جاتی۔ اس کی جائیداد اور اس کی کمائی محض اس کے اپنے استعمال کے لئے ہے سوائے اس کے جسے وہ بخوشی اپنے شوہر کو دیدے۔ ساتھ ہی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ

اسلام عائلی زندگی کی پر زور حمایت کرتا ہے نوجوانوں کو زوردار انداز سے شادی پر ابھارتا ہے اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ طلاق کی مذمت کرتا ہے اور تجرد کو پاکدامنی اور خیر کا درجہ نہیں دیتا۔ اس لئے حقیقی اسلامی معاشرہ میں ازدواجی زندگی کا رواج ہوتا ہے اور تجرد زندگی کی مثال شاذونادر ہی مل پاتی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ میں تمام شادی کی عمر کو پہنچنے والے مرد و عورت کی شادی ہو جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہر ایک اس بات کی تائید کرے گا کہ عموماً مسلم مردوں کی معاشی ذمہ داریاں مسلم عورتوں کے مقابلہ میں کافی زیادہ ہیں۔ اس طرح قوانین میراث کا مطلب اس عدم توازن کی تلافی کرنا ہے۔ اس طرح سماج جنس اور مرتبہ کی تمام جنگوں سے اوپر اٹھ کر زندگی گذارتا ہے۔ مسلم عورتوں کے فرائض اور ان کی معاشی ذمہ داریوں کے درمیان عام موازنہ کرنے کے بعد ایک برطانوی مسلم خاتون اس نتیجہ تک پہنچتی ہے کہ اسلام نے عورتوں کے تعلق سے نہ صرف یہ کہ بہتر رویہ اختیار کیا ہے بلکہ فیاضی سے کام لیا ہے۔

یہودیت، نصرانیت اور اسلام تینوں مذاہب خاندان اور شادی کی اہمیت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ تاہم قوامیت کے حدود کے سلسلہ میں تینوں مذاہب کے درمیان نمایاں فرق بھی پائے جاتے ہیں۔ یہودی۔ عیسائی دستور برخلاف اسلام کے شوہر کی قوامیت کو عملاً اپنی بیوی کی ملکیت تک پہنچا دیتے ہیں۔

وراثت کے جدید قوانین پر قرآن مجید کے احکامات کی فضیلت

قرآن کا فیصلہ ہے کہ مردوں کو وراثت میں عورتوں کے حصہ کا دوگنا ملے گا۔ میراث کے سلسلہ میں قرآن کا حکم مکمل طور سے منصفانہ اور عورتوں کے لئے سراپا رحمت ہے۔ یہ منصفانہ ہے کیوں کہ اکثر حالات میں اور اسلامی شریعت کے مطابق شوہر، بیوی اور بچوں دونوں ہی کے لئے رزق فراہم کرتا ہے۔ جبکہ عورت پر کسی قسم کا قانونی دباؤ نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے کمائی کرے۔ اس طرح مردوں کے مقابلہ میں نصف حصہ کی تعیین کے ذریعہ اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔ یہ سراپا رحمت ہے کیوں کہ لڑکی کی ذات نازک اور غیر محفوظ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے والدا سے بہت چاہتے ہیں جو قرآنی حکم کو مانتے ہیں اور اسے ایسی اولاد نہیں سمجھتے جو ان کی نصف دولت کو دوسرے تک منتقل کرکے ان کے لئے نقصان کی سبب بنے۔ مزید براں اس کے بھائی اس پر ترس کھاتے ہیں اور اس کی حفاظت

کرتے ہیں اس سے حسد نہیں کرتے۔ یعنی وہ اسے خاندانی ملکیت کی تقسیم میں اپنا رقیب نہیں سمجھتے۔
اس طرح محبت اور ترس کا تحفہ جو لڑکی کو اپنے خاندان سے ملتا ہے وراثت میں اس کے جزوی نقصان کی تلافی کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موہوم رحم دلانہ جذبات کے ذریعہ اس کے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ کرنا رحم دلی کے بجائے حد درجہ ناانصافی ہوگی۔ موہوم اور غیر حقیقی اس لئے کہ اللہ رب العزت سے زیادہ کون رحم دل ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر قرآنی حدود کا لحاظ نہ رکھا جائے تو عورتیں خاندان میں ظلم و استحصال کا شکار ہو جائیں گی۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ خصوصاً موجودہ دور کی وحشیانہ خود غرضی کی نظر میں جو دور جاہلیت کے ظلم و جبر کی طرح برا ثابت ہو سکتا ہے جب کہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآن کے تمام احکام، وراثت سے متعلق قوانین کی طرح، اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں جو آیت میں بیان کی گئی ہے "اے محمد! ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تمام مخلوق کے لئے رحمت بنا کر۔"

مختصر یہ کہ تہذیب حاضر سراپا نظام ظلم و جبر ہے کیوں کہ یہ حقیقی انسانی قدروں سے خالی ہے ماؤں کو حقوق سے محروم کر کے لڑکیوں سے زیادہ ان پر ظلم کرتا ہے۔ بہترین اور خالص ترین خدائی عکس ہونے کی وجہ سے ماں کی محبت دنیا کی مقدس ترین حقیقت ہے۔ ماں اتنی رحم دل، خود کو نثار کر دینے والی اور قربانی دوست ہے کہ وہ بچوں کی خاطر اپنی تمام چیزوں کو قربان کر دیتی ہے حتیٰ کہ جان کا نذرانہ بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ مثلاً ایک ڈرپوک مرغی جس کی مادرانہ شفقت انتہائی معمولی درجہ کا نمونہ پیش کرتی ہے، وہ اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے کتے پر حملہ کرتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔

اس دلیل کی روشنی ان کے لئے بالکل واضح ہے جو حقیقی معنوں میں آدمی ہیں اگر چہ ان کے لئے واضح نہیں جو بظاہر تو آدمی نظر آتے ہیں لیکن اصلاً حیوانوں جیسے ہیں کہ کتنی بڑی ناانصافی اور کتنی شرمناک بے عزتی ہے! کتنی دل فگار احسان فراموشی اور سماجی زندگی کے لئے کتنا نقصاندہ یہ ذہر ہے کہ اتنی محترم اور محبوب ذات کو بیٹے کے مال میں جائز حق سے اس کو محروم کر دیا جائے۔ جیسا کہ قرآنی فرمان ہے جو بیٹے کی وراثت میں ماں کو چھٹا حصہ دیتا ہے جیسا کہ آیت میں ہے "... اور اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے..." یہ بنیادی حقائق اور عدل و انصاف کے بالکل مطابق ہے۔

عورت کے ساتھ شوہر کے رول کے متعلق یہودی قانون اس تصور سے دو کتا ہے کہ وہ غلام کی طرح اپنی بیوی کا مالک ہوتا ہے۔ شوہر کی بیوی کی قسموں کو منسوخ کرنے کی اہلیت اور بدکاری کے

قوانین میں دوہرے معیار کی کلی وجہ یہی تصور رہا ہے۔ جائیداد یا کمائی پر عورت کو کسی قسم کا اختیار نہ دینے میں بھی اسی تصور کا عمل دخل ہے۔ جوں ہی کسی یہودی عورت کی شادی ہوتی ہے وہ مکمل طور سے اپنی کمائی اور جائیداد پر شوہر کے ہاتھوں اپنا اختیار کھو بیٹھتی ہے۔ یہودی احبار نے بیوی کی جائیداد پر شوہر کے حق کو اس کے بیوی کے مالک ہونے کا بدیہی نتیجہ کہا ہے۔ "جب کوئی عورت کے اختیار پر غالب آ جائے تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کی جائیداد کی ملکیت پر بھی غالب آ جائے گا؟" اس طرح شادی ایک دولت مند عورت کے عملاً مفلس بننے کا سبب بن گئی۔ تلمود بیوی کی معاشی حیثیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"کوئی عورت کسی چیز کی مالک کیسے بن سکتی ہے؟ اس کا جو کچھ ہے وہ اس کے شوہر کی ملکیت ہے۔ جو کچھ اس کا ہے وہ اس کا ہے۔ اور جو کچھ بیوی کا ہے وہ بھی اسی (شوہر) کا ہے..........
...بیوی کی کمائی اور جو کچھ بھی وہ کہیں سے پا سکتی ہے وہ بھی اسی (شوہر) کا ہے۔ خانگی سامان حتیٰ کہ دسترخوان پر پڑے روٹی کے ٹکڑے بھی اسی کے ہیں۔ اگر بیوی کسی مہمان کو اپنے گھر مدعو کرے اور اسے کھلائے پلائے تو وہ اپنے شوہر سے چوری کرے گی۔" (San71a,Git 62d)

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہودی عورت کی جائیداد شادی کرنے والوں کی کشش کا ذریعہ تھی۔ یہودی خاندان باپ کی جائیداد کا ایک حصہ اپنی بیٹی کے نام کر دیتا ہے۔ جو شادی کے موقع پر بطور جہیز استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اسی جہیز نے یہودی لڑکیوں کو باپ پر ایک ناپسندیدہ بوجھ بنا ڈالا سالہا سال باپ کو بیٹی کی پرورش کرنی پڑتی اس کے بعد وہ بڑی مقدار میں جہیز کا انتظام کر کے اس کی شادی کی تیاری کرتا تھا۔ اس طرح یہودی خاندان میں لڑکی کی حیثیت سرمایہ کے بجائے ایک قرض کی سی ہوگئی۔ یہ قرض واضح کرتا ہے کہ قدیم یہودی سماج میں بچی کی پیدائش پر خوشی کیوں نہیں منائی جاتی تھی۔ جہیز، شادی ہو وہ تحائف جو دولہے کرایہ داری کی شرائط کے ساتھ دیئے جاتے تھے۔ شوہر جہیز کے عملی مالک کی حیثیت سے اس کو برت سکتا تھا مگر اسے بیچ نہیں سکتا تھا۔ عورت شادی کے وقت ہی جہیز کا ہر اختیار کھو بیٹھتی۔ مزید براں شادی کے بعد اس سے کام کرنے کی امید کی جاتی تھی اور اس کی تمام کمائی اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری کے عوض اس کے شوہر کو مل جاتی تھی جو اسی کی ذمہ داری تھی۔ اسے دو صورتوں میں ہی اس کی جائیداد واپس مل سکتی تھی طلاق یا شوہر کی وفات۔ اگر وہ پہلے مر جاتی تو شوہر

اس کی جائیداد کا وارث بن جاتا۔ شوہر کی وفات کی صورت میں بیوی شادی سے پہلے کی جائیداد تو دوبارہ پا سکتی تھی مگر بیوی کو اپنے متوفی شوہر کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ شوہر کو بھی اپنی بیوی کو شادی کا تحفہ پیش کرنا پڑتا تھا تاہم وہ شادی برقرار رہنے تک اپنے تحفہ کا عملی طور پر مالک بنا رہتا تھا۔

اسی یہودی قانون پر ابھی تک عیسائی بھی کاربند ہیں۔ شادی کی قدر افزائی کے لئے بطور شرط کلنٹائن کے بعد عیسائی رومی بادشاہ کے زمانہ میں مذہبی اور سیاسی دونوں ہی ارباب اقتدار نے جائیداد کے متعلق معاہدہ کا مطالبہ کیا۔ خاندانوں نے بیٹیوں کو اضافی جہیز دیا۔ نتیجۃً مردوں نے جلد شادی کرنے میں دلچسپی کا اظہار کیا جبکہ خاندانوں نے عام رواج کے مقابلہ میں باپوں نے اپنی بچیوں کی شادی مزید تاخیر سے کی۔ کینن قانون میں نکاح فسخ ہو جائے تو بیوی کو جہیز کی واپسی کا اختیار دیا گیا تھا جب تک کہ عورت بدکاری کے جرم میں ملوث نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس جہیز کے حق سے وہ محروم ہو جاتی تھی جو اس کے شوہر کے قبضہ میں ہوتا۔ کینن اور شہری قانون کے مطابق عیسائی یورپ اور امریکہ میں شادی شدہ عورت کو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک جائیداد کا حق حاصل نہ تھا۔ مثلاً برطانوی قانون کے تحت حقوق نسواں کی ترتیب و اشاعت ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ انھیں حقوق میں ہے "شوہر جن چیزوں کا مالک ہے وہ اس کی اپنی ہیں اور بیوی کی ملکیت میں جو کچھ ہے وہ بھی شوہر کا ہے۔"

بیوی شادی کے وقت نہ صرف اپنی جائیداد سے محروم ہو جاتی تھی بلکہ اپنی شخصیت کو بھی کھو بیٹھتی تھی۔ اس کے کسی کام کی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ کسی پابند کرنے والی قانونی حیثیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے شوہر، بیوی کے کسی بھی تحفہ یا خرید و فروخت کے معاملہ کو مسترد کر سکتا تھا۔ وہ شخص جس سے وہ کسی قسم کا معاہدہ کرتی تھی اسے فریب میں شریک مجرم کی حیثیت سے گرفتار کر لیا جاتا۔ مزید برآں نہ وہ اپیل کر سکتی تھی نہ اس کی طرف سے اپیل کی جا سکتی تھی اور نہ شوہر کے خلاف اپیل کر سکتی تھی۔ شادی شدہ عورت کو قانون کی نظر میں عملاً ایک بچے کی حیثیت حاصل تھی۔ بیوی بلاواسطہ اپنے شوہر سے متعلق ہوتی تھی اسی لئے وہ اپنی جائیداد، اپنی شخصیت اور اپنے خاندانی نام کو کھو بیٹھتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی ہی سے اسلام نے عورت کو آزاد شخصیت تسلیم کیا ہے جس سے مغربی

یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے ابھی تک محروم رکھا تھا۔ اسلام میں دلہن اور اس کے گھر والوں پر دولہے کو کچھ بھی پیش کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مسلم خاندان میں لڑکی کی حیثیت قرض کی نہیں اسلام نے عورت کو اتنا شرف بخشا ہے کہ اسے متوقع شوہروں کی کشش کے لئے تحائف پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ دولہے کو ہی شادی کا تحفہ (مہر) پیش کرنا ضروری ہے۔ یہ تحفہ اس کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ نہ تو دولہا اور نہ ہی دلہن کے خاندان کا کوئی فرد اس میں حصہ دار ہوتا ہے اور نہ اس پر کوئی اختیار۔ عورت مہر کی مالک ہوتی ہے خواہ کچھ دنوں بعد ہی طلاق ہو جائے۔ شوہر کو بیوی کی جائیداد میں حصہ دار بننے کی اجازت نہیں دی گئی ہے سوائے اس کے جو کچھ وہ اپنی مرضی سے بخوشی دے دے۔ اس معاملہ میں قرآن نے بالکل واضح طور پر بیان کر دیا ہے "اور عورتوں کو شادی کے وقت مفت تحفہ کے طور پر انھیں ان کا مہر دے دو۔ البتہ اگر وہ بطیب خاطر اس میں سے کچھ حصہ تمہیں دیدیں تو لے لو اور خوشی سے اسے استعمال کرو۔" (۴:۴)

عورت کی جائیداد اور کمائی اس کے مکمل اختیار میں ہے اور صرف اسی کے تصرف کے لئے ہے۔ کیوں کہ اس کے اور بچوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ بیوی کتنی مالدار ہے۔ (بیوی چاہے جتنی مالدار ہو اسے خاندان کے معاشی معاون کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ خود اپنی مرضی سے ایسا کرنا پسند نہ کرے۔ مرد و زن دونوں ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں۔ مزید براں اسلام میں شادی شدہ عورت اپنی آزاد قانونی شخصیت اور اپنے خاندانی نام کی مالک ہوتی ہے۔ ایک بار ایک امریکی جج نے مسلم عورتوں کے حقوق پر یہ کہتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "ایک مسلم عورت دس مرتبہ شادی کر سکتی ہے مگر اس کی انفرادیت اس کے مختلف شوہروں کے ذریعہ گم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی قانونی حیثیت کے ساتھ ایک شمسی سیارہ ہے۔" شریعت شادی سے پہلے اور شادی کے بعد عورتوں کے مکمل حقوق کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ خرید و فروخت کر سکتی ہے۔ اور اپنی تمام یا کچھ جائیداد مرضی کے مطابق پٹے پر رکھ سکتی اور روایتی طور پر حقیقتاً رکھ بھی ہے۔ جو ان کے قانونی وجود کی حیثیت سے ان کے آزادانہ حقوق ملکیت کی علامت ہے۔

مالی ضمانت کی عورتوں کو یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ غیر محدود طریقہ سے انھیں شادی کے موقع پر تحائف قبول کرنے اور خود اپنی ضمانت پر حال اور مستقبل کی ملکیت اور آمدنی رکھنے کا اختیار دیا

گیا ہے حتیٰ کہ شادی کے بعد بھی۔ کسی بھی شادی شدہ عورت سے اس کی اپنی جائیداد اور آمدنی سے کسی بھی رقم کو گھریلو اشیاء پر خرچ کرنے کا بالکل مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ تاہم مخصوص حالات میں مثلاً جب اس کا شوہر بیمار ہو، معذوری یا بے روزگاری کا شکار ہو جائے تو اپنے خاندان کی ضروریات کی فراہمی کے لئے اپنی کمائی اور بچت میں سے خرچ کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اگرچہ یہ قانونی ذمہ داری نہیں ہے پھر بھی باہمی لحاظ محبت اور خاندان کے افراد کے مابین تعاون سے ہم آہنگ ہے۔ عورت کو شادی کے دوران اور طلاق یا خاوند کی وفات کی صورت میں دوران عدت (مدت انتظار) مکمل مالی تعاون پیش کیا جاتا ہے۔ مزید براں کچھ ماہرین قانون (فقہاء) طلاق اور بیوگی کی صورت میں ایک سال کا مطالبہ کرتے ہیں یا دوسری شادی نہ ہونے تک کا، اگر شادی پہلے ہو جائے تو سال کی قید نہیں رہتی۔

عورت جس کے ساتھ شادی کے وقت بچہ بھی ہو تو بچے کے باپ سے اس کی پرورش کا مکمل خرچ دلایا جاتا ہے۔ عموماً مسلم عورت کو تاحیات تعاون کی ضمانت دی جاتی ہے۔ بیٹی، بیوی، ماں اور بہن ہر حیثیت سے۔ مالی فوائد ہر صورت میں عورت کو ملتے ہیں نہ کہ مرد کو اور خاندان میں سماجی حصہ دار ہیں ان شرائط میں جن کو قرآن مجید قوانین وراثت میں ذکر کرتا ہے۔ جو مرد کو اکثر صورتوں میں عورت کو ملنے والی میراث کا دوگنا دیتے ہیں۔ مردوں کو زیادہ حصہ تو ملتا ہے لیکن بالآخر مالی لحاظ سے وہ اپنی عورت رشتہ داروں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی بیویوں، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کے۔ عورت کو کم حصہ ملتا ہے لیکن اس پر اپنے حصوں سے خرچ کرنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی حتیٰ کہ غذا، کھانے، کپڑے، رہائش وغیرہ کے لئے بھی بلکہ وہ اپنے حصوں کو معاشی تحفظ کے لئے رکھے رہتی ہیں

خیال رہنا چاہئے کہ اسلامی معاشرہ سے قبل بسا اوقات عورتیں خود سامان وراثت بن جاتی تھیں حتیٰ کہ اسلام کی بعثت کے باوجود میت کی تمام جائیداد اس کے سب سے بڑے بیٹے کو دے دی جاتی تھی۔ تاہم قرآن مجید نے واضح کیا کہ والدین یا قریبی رشتہ داروں کی جائیداد کا ایک متعین حصہ مردوں اور عورتوں دونوں کو ملے گا۔ "والدین یا اقارب کے ذریعہ چھوڑی گئی جائیداد میں مردوں کا حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ چاہے جائیداد کم ہو یا زیادہ، متعین حصہ ہے۔" (۴:۷)

ملازمت

عورت کے حق ملازمت کے تعلق سے پہلے یہ واضح ہونا چاہئے کہ اسلامی معاشرہ میں ماں

اور بیوی کی حیثیت سے عورتوں کے رول کو انتہائی مقدس اور ضروری حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ نہ تو خادمہ اور نہ ہی دایا آزاد اور وہ متعدد رفقاء توجہ بچے کی پرورش کرنے والی کی حیثیت سے کسی بھی صورت میں ماں کے مقام کو نہیں پا سکتی ساتھ پاکیزہ اور موثر رول کو جو بڑی حد تک قوم کے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے بیکاری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر شادی کے وقت بطور شرط اس کے ملازمت کے حق کو تسلیم نہ کیا گیا ہو اور وہ ملازمت کی خواہش مند ہے تو شادی شدہ عورت کو شوہر کی اجازت لینی ہوگی۔

بایں ہمہ اسلام میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو عورتوں کو ملازمت کرنے سے روکتا ہو جب بھی اس کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان صورتوں میں جو اس کی فطرت سے بہت مناسبت رکھتی ہیں اور جنکی معاشرہ کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ان پیشوں تیمارداری، تدریس (خصوصاً بچوں کی) طب، سماجی اور رفاہی کام ان پیشوں کے نمونے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی بھی میدان میں عورتوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کچھ متقدمین فقہاء مثلاً امام ابو حنیفہؒ اور امام طبریؒ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ کہ مسلم عورت کو جج کے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے فقہاء کی آراء مختلف ہیں تاہم کسی بھی فقیہ نے قرآن و سنت سے کسی ایسے نص کو پیش نہیں کیا ہے جو عورتوں کو صاف طور سے کسی اہم ملازمت سے خارج کرے سوائے مملکت کی خلافت کے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے ام الشفاء بنت عبداللہ نامی عورت کو منڈی کی نگراں کی حیثیت سے متعین کیا تھا جو ہمارے دور میں ناظم شعبہ تحفظ صارفین کے عہدہ کے مثل ہے۔

جن ممالک میں مسلم اقلیت میں ہیں بعض مسلم عورتیں ماں کی حیثیت سے اپنے رول کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی زندگی کی بقا کے لئے مجبور کی جا سکتی ہیں۔ یہ خاص طور سے مطلقات اور بیواؤں کی صورت میں حقیقت ہے۔ اور مذکورہ بالا معاشی تحفظ فراہم کرنے والی عدم موجودگی میں۔

میں اس دیباچہ کی پیش کش میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تحقیق سے میرا مقصد یہودیت و عیسائیت کی تحقیر نہیں ہے۔ بحیثیت مسلم دونوں کی خدائی حقیقت پر ہمیں یقین ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو خدا کے عظیم پیغمبروں کی حیثیت سے تسلیم کئے بغیر کوئی بھی مسلم نہیں ہو سکتا۔ میرا مقصد اسلام کو بری الذمہ قرار دینا ہے اور یورپ میں بڑی تاخیر سے نسل انسانی کے لئے خدا کی

طرف سے آنے بچے پیغام کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ میں یہ بھی دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے خود کو صرف عقیدہ سے جوڑا ہے مطلب یہ ہے کہ میری دلچسپی خاص طور سے تینوں مذاہب کی اصل کتابوں میں موجود عورت کی حیثیت سے ہے نہ کہ آج دنیا میں موجود ان کے لاکھوں متبعین کی عملی حیثیت سے۔ یہ اصل سے دلچسپی اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ کسی مذہب کو نظریات اور محض نام نہاد پیروکاروں کے رویہ سے سمجھنا گمراہ کن ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ تہذیب کو مذہب سے گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ بہت سے دوسرے نہیں جانتے کہ ان کی مذہبی کتابیں کیا کہہ رہی ہیں، اور بہت سے بے پروا ہوتے ہیں۔ اسلام کو وہ مذہب سمجھنا چاہیے جس نے عورتوں کے معیار کو بہت بلند کیا ہے اور ان کے لئے بہت سے وہ حقوق تسلیم کئے ہیں جنہیں موجودہ زمانے محض اس صدی میں تسلیم کیا ہے۔

اسلام کے پاس اب بھی عصر حاضر کی عورت کے لئے بہت کچھ ہے۔ قدر و منزلت، عزت واحترام، پیدائش سے وفات تک ہر حال میں اور ہر قسم کا تحفظ، علاوہ ازیں قدر افزائی، توازن، اور اس کی تمام روحانی، ذہنی، جسمانی اور جذباتی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع ......☆

تلخ و شیریں — میرا گلا خراب ہے

ثناء اللہ سیالکوٹی

اخباری اطلاعات کے مطابق پاکستان میں بلدیاتی امیدواروں کے کاغذوں کی نامزدگی کی جانچ پڑتال کے دوسرے روز فیصل آباد کے شہر کے متعدد ریٹرننگ آفیسروں نے ناظم اور نائب ناظم کے امیدواروں سے آسان اور مشکل سوالات پوچھے، اکثر امیدوار آسان سوالات کے جوابات بھی نہ دے سکے۔ زیادہ تر ریٹرننگ آفیسروں نے دعاء قنوت اور نماز جنازہ سنانے کے بارے میں کہا، پچاس فیصد امیدوار سنا نہ سکے، انہیں ایک دن کی مہلت دی گئی، جب کچھ یاد کر کے آگے تو ان سے التحیات سنانے کے لئے کہا، جس پر کئی امیدواروں نے احتجاج بھی کیا، اور کہا کہ یہ کیا بات ہوئی، ہم رات بھر دعاء قنوت یاد کرتے رہے اور آپ التحیات پڑھنے کو کہہ رہے ہیں، جس پر ان کے کاغذات بھی مسترد کر دیئے گئے، ضلع کے ریٹرننگ آفیسر چوہدری غلام دستگیر کے دفتر میں سوالات کے درمیان بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی، سوالات و جوابات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بڑی عید کب آتی ہے؟ چھوٹی عید کے بعد... سورہ فاتحہ سنایئے؟ میرا گلا خراب ہے ... مکہ اور مدینہ میں کیا فرق ہے؟ تین سو کلو میٹر کا... حاجی کنکریاں کیوں مارتے ہیں؟ حاجیوں کا شیطان کے ساتھ مقابلہ ہوتا ہے... زبور کس پیغمبر پر نازل ہوئی؟ حضرت ابراہیم پر... سرور کا معنی کیا ہے؟ حضرت نبی سرور رحمۃ اللہ علیہ... قائد اعظم کہاں پیدا ہوئے؟ مدینہ شریف میں...

قارئین کرام! انہیں سوالات و جوابات پڑھ کر کوئی حیرانگی اور تعجب نہیں ہوا، یہ کونسلروں کا حال ہے، ہمارے ملک کے بڑے بڑے سیاست دان جو حکمران بھی ہوئے، سیاست پر چھائے رہے، جنہیں یہ ناز تھا کہ وہ عقل کل رکھتے ہیں، وہ ایک بڑے جلسہ میں خطاب کر رہے تھے، اذان کی آواز آنے لگی، کسی نے کہا اذان کی آواز آرہی ہے خاموش ہو جائیں، تو انہوں نے اعلان کیا، لوگ خاموش ہو جائیں اذان بج رہی ہے اسی طرح ایک لیڈر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے، یہ دکھانے کے لئے کہ وہ بڑے مذہبی ہیں، تو انہوں نے جوتے نہیں اتارے، کسی نے بتایا مسجد ہے، جوتے اتار دیں، کہنے لگے اچھا مسجد میں جوتے اتار لے جاتے ہیں ..... اسی طرح ایک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رمضان المبارک میں سگریٹ پینے لگے، کسی نے

کھار دے ہیں سگریٹ نہ پئیں، انھوں نے کہا چھ روزے میں سگریٹ نہیں پی جاتی.....

ہمیں کچھ حیرانگی ان ریٹائرنگ آفیسروں پر ہوئی جو امیدواروں سے دعاء قنوت اور نماز جنازہ کے بارے میں پوچھتے رہے، حالانکہ ان بے چاروں نے کبھی فرض ہی نہیں ادا کئے، تو وتر کیسے پڑھتے ہوں گے، اس لئے ان کو کیا پتہ دعا قنوت کیا ہوتی ہے، اسی طرح نماز جنازہ جو کہ فرض کفایہ ہے اس کے بارے میں کیسے پتہ ہو جب کہ وہ فرض بھی ادا نہیں کرتے، کاغذات تو ان کے مسترد ہو گئے تھے، اگر جسارت کرتے اور ریٹائرنگ آفیسروں سے سوال کرتے تو امید تھی کہ ان آفیسروں کو بھی جوابات نہ آتے ... ہمیں ایک خان صاحب کا قصہ یاد آیا جنھوں نے ایک غیر مسلم کو پکڑا، اسے کہا کلمہ سناؤ ورنہ تمہیں قتل کر دوں گا، وہ کہنے لگا مجھے نہیں آتا، آپ مجھے بتا دیں، خان صاحب کہنے لگے، خو چہ کلمہ تو مجھے بھی نہیں آتا، پھر افسوس کر کے کہنے لگے اگر مجھے کلمہ آتا ہوتا تو ایک آدمی کو مسلمان تو کر دیتا، یہی حالت ہمارے ریٹائرنگ آفیسروں کی ہوتی۔

ہماری حکومت اور اکثر علماء کرام خود ان جاگیرداروں کی طرح چاہتے ہیں کہ نہ ان کے علاقے میں کوئی اسکول نہ سڑک ہوتی تاکہ یہ ترقی نہ کر سکیں، علمائے کرام خود بھی چاہتے ہیں کہ عوام کے پاس دینی شعور نہیں آنا چاہئے، اگر کچھ آیا تو مسئلے مسائل خود جان گئے تو ان کے دال روٹی کیسے چلے گی، عوام میں جتنی جہالت ہوگی ان کی رسومات و بدعات کی اتنی ہی مانگ ہوگی، اگر لوگ قرآن و حدیث سے واقف ہو گئے تو ان کی دینی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب قرآن مجید کا ترجمہ کیا تو ان پر بڑے فتوے لگائے گئے کہ یہ کافر ہو گیا ہے، یہ کہتا ہے کہ میں نے قرآن مجید کو سمجھ لیا ہے، اللہ کے راز کو کون سمجھ سکتا ہے، اس لئے انھوں نے لوگوں کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہے، آپ قرآن و حدیث کو نہیں سمجھ سکتے، اگر سمجھنے کی کوشش کی گمراہ ہو جاؤ گے، کوئی کام بھی کرنا ہے ان کے توسط سے کریں، اذان دینی ہو تو ان کی خدمات حاصل کریں، بچے کا نام رکھنا ہے تو ان کے پاس جائیں، نکاح ان کے بغیر نہیں ہو سکتا، امامت بھی یہ کرا سکتے ہیں، ختم کی دیگیں تو مردے تک پہونچے گا، ان کے علاوہ لوگوں کو دین سے دور رکھنے کا اور حربہ بھی اختیار کرتے ہیں، انھیں جزوی اختلافات میں الجھائے رکھیں، اصل مسائل کی طرف آئیں ہی نہ، حکومت، لیڈر، علماء کرام سب مل کر ایک پلان کے تحت لوگوں کو دین سے دور رکھتے ہیں، تاکہ ان کی اجارہ داری قائم رہے ان کا کاروبار چلتا رہے، یہ عوام پر حکمرانی کرتے رہیں۔ (احمد شکر بحوالہ تفہیم)

مذاہب عالم

ہندو دھرم

انیس احمد فلاحی

یوگا واشسٹھا (Yoga Vashishta)

یہ کتاب ہندو دھرم کی بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مؤلف بھی غیر معروف ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں اس کی تدوین اس وقت عمل میں آئی جب آریوں نے شمالی ہند میں اپنا قبضہ جما لیا تھا اور اپنی دینی، سیاسی، اور اجتماعی زندگی کو منظم کرنے میں مصروف تھے۔ یہ کتاب اخلاقی اور لاہوتی دروس پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۳ ہزار اشعار پائے جاتے ہیں۔ واشسٹھا راہب اپنے شاگرد رام چندر کو لاہوتی روحانی علوم اور ریاضت و مراقبے کے اس علم کی تعلیم دیتے تھے جو انسان کو عالم روحانی اور ملاء اعلیٰ تک پہنچاتے ہیں۔ حتیٰ کہ پھر انسان کی روح برہما کی روح سے جا ملتی ہے۔ یہ کتاب انھیں اسباق کا مجموعہ ہے۔ اس میں یوگا کے تین مشہور طریقوں کا تذکرہ ہے۔

۱۔ اتحاد کا عقیدہ

یعنی انسان اپنے نفس پر اس قدر کنٹرول کرے کہ اس کا نفس اسا کے تابع ہو جائے۔ اور جس کا نفس دنیوی آلائشوں کی محبت سے پاک ہو گیا گویا اس نے تمام ہی غموں سے نجات پالی۔

۲۔ نفسانی خواہشات کی مخالفت

اس کتاب کے بیان کے مطابق انسانی زندگی غلطیوں اور گناہوں سے عبارت ہے اور نفسانی خواہشات انسان کو تباہی و بربادی کی جانب لے جاتی ہیں جن میں پھنس کر انسان ابدی غم میں مبتلا ہو جاتا ہے الا یہ کہ وہ یوگا کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کر کے خوشی کی ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کی روح دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو کر ملاء اعلیٰ میں برہما کی روح سے جا ملے۔

اس کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

یہ دنیا جس میں ہر انسان مرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہاں سعادت کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر شے زوال پذیر ہے۔ اس کی خوشیاں فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیوں کہ ہر خوشی کے بعد غموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں کسی نے خریدا نہیں ہے پھر بھی ہم مسلسل اس طرح کام کرتے ہیں گویا کسی کے غلام ہوں۔

بندروں کی اچھل کود کی طرح انسانی نفس میں خواہشات رواں دواں ہیں۔ انسانی نفس کبھی آسودہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنی تقدیر پر قناعت کرتا ہے، بلکہ ہمیشہ مزید سے مزید کے حصول کی سعی میں لگا رہتا ہے۔

جسم ہر بھلائی سے خالی اور تمام آفتوں کا محل ہے۔ غور کیجئے بچپن کس قدر ضعف و عاجزی سے عبارت ہے کہ انسان ان ایام میں تعبیر پر بھی قادر نہیں ہوتا اور جوانی کے ایام بجلی کی چمک کی مانند آتے اور غائب ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے انتہائی تکلیف دہ بڑھاپا چھوڑ جاتے ہیں زندگی اس شمع کی لو کے مانند ہے جو صحرا میں جل رہی ہو اور جس کی لو کو ہوائیں ہر سمت اڑا رہی ہوں اور یہی حال دنیا کی تمام اشیاء کا بھی ہے جن کا ظہور بجلی کی چمک کے مانند تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی ہیں۔ (دیکھئے ادیان الہند الکبری احمد شلبی ص ۷۱)

ویدانت (Vedant)

ویدانت کے معنی وید کا خلاصہ۔ ویدانت ہندوؤں کے یہاں اخلاقیات اور فلسفہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ حجم کے لحاظ سے اگرچہ یہ کتاب کافی چھوٹی ہے لیکن ہندوستانی فلسفہ اور ہندوستانی رہبانیت پر اس کتاب کے اثرات دیگر مذہبی کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کتاب کو برہما سوتر بھی کہا جاتا ہے۔

مؤلف کتاب

بعض ہندو علماء اسے وید ویاس کی تصنیف مانتے ہیں لیکن متاخرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس کے مؤلف بادارایان (Badarayan) ہیں جو گوتم بدھ اور مسیح علیہ السلام کے ہم عصر تھے چنانچہ انھوں نے اس کتاب میں گوتم بدھ کے ملحدانہ افکار و نظریات پر جگہ جگہ مضبوط گرفت کی ہے

کتاب کی محتویات

یہ کتاب چار ابواب اور سولہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں برہما کی عبادت اور اس کے طریقے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں وحدۃ الوجود کے نظریہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نیز بودھ مت اور جین مت کے الحادی افکار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں نجات کے حصول کے دو مشہور طریقوں کا تذکرہ ہے ۱۔ طریقۂ بندگی ۲۔ معرفت الٰہی

چوتھے باب میں مجتہد کی جزاء اور نجات یافتہ روحوں کا بیان ہے۔

مضامین

اس کتاب میں ہندی فلسفہ کے بنیادی اور اہم مسائل بیان کئے گئے ہیں جیسے معرفت خداوندی، روح اور تناسخ ارواح، موت کے بعد کے احوال، قانون جزاء، علم الٰہی اور نجات وغیرہ نیز تین ابدی حقائق کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۔ روح کی قدامت اور ازلیت۔

۲۔ پوری کائنات خدا ہے البتہ اس کی تجلیات کا ظہور انسانی روح میں ہوتا ہے کیوں کہ یہ روح تمام دیگر شکلوں سے بہتر اور حسین ہے۔

۳۔ حقائق کا پس پردہ چلا جانا اور کذب کا ظہور

ویدانت کے شارحین کے طریقہائے تفسیر

ویدانت کے شارحین کے دو مختلف طریقہائے تفسیر ہیں:

۱۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ جسے وہ "اَدویت واد" کہتے ہیں۔

۲۔ دو حقیقتوں کے اعتراف کا نظریہ جسے وہ "دویت واد" کہتے ہیں۔

پہلے طریقۂ تفسیر کے مشہور علمبردار شنکر آچاریہ اور دوسرے کے رامانج ہیں۔

دونوں طریقہائے تفسیر میں اہم فرق

مذکورہ بالا دونوں طریقہائے تفسیر میں درج ذیل اہم اور بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔

۱۔ شنکر آچاریہ خدا کی جملہ ذاتی اور وصفی صفات کا انکار کرتے ہیں اور خدا کو "نرنکار" (یعنی صفات سے خالی و عاری خدا) سے موسوم کرتے ہیں۔ جب کہ رامانج خدا کی ذاتی صفات کے قائل ہیں

ان کا خیال ہے کہ ذاتی صفات کے بغیر خدا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ شنکر آچاریہ کہتے ہیں وہ تمام اشیاء جنھیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ حقائق نہیں ہیں بلکہ نظر کا فریب ہے اور یہ پوری کائنات اس خواب کے مانند ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ پوری کائنات کی مثال وہ رسی ہے جو رات میں سانپ دکھائی دیتی ہے چند دنیا کا یہ کھیل جو کھیل کے مانند ہے جب ختم ہو جائے گا تو ذات باری کے علاوہ کوئی وجود باقی نہ رہے گا۔

شنکر آچاریہ اس کتاب کی تفسیر میں ایک مقام پر لکھتے ہیں "کھانے پینے، چلنے پھرنے والا یہ انسان حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت میں خدائی حقیقت کو دیکھے۔ یہ کہنا بالکل درست ہے آپ انسان بھی ہیں اور خدا بھی خالق بھی اور مخلوق بھی اور عابد بھی اور معبود بھی خدا کی ذات کا ادراک مکمل معرفت اور جملہ آلائشوں سے پاک ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ شنکر آچاریہ کے نزدیک شرک یہ ہے کہ انسان یہ گمان کرے کہ وہ اللہ کو پہچانتا ہے۔ مدامانج مذکورہ بالا نظریہ کے برعکس دو حقیقتوں کے قائل ہیں۔ وہ کائنات کو خدا سے علیحدہ ایک مکمل حقیقت مانتے ہیں جو خدا ہی کا ایک جزء ہے ان کا خیال ہے کہ نفس انسانی کو خیر و شر کو اختیار کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے اور اس کی نجات کا دارومدار محض اس امر پر ہے کہ برہما کا فضل اور اس کی عنایت اس کے شامل حال ہو جائے۔

مذکورہ بالا دونوں مشہور طریقوں کے علاوہ ویدانت کی تفسیر کے اور بھی قطعہائے نظر ہیں البتہ انھیں قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ جیسے نمبارک (Nimbark) کا طریقہ تفسیر جو خدا کی وحدانیت کو دو میں اور دو کو ایک میں شامل مانتے ہیں۔ اور مادھو اچاریہ کا طریقہ تفسیر جو برہما اور کائنات دونوں کی قدامت اور ازلیت کے قائل ہیں اور خالق و مخلوق کے درمیان فرق قائم کرتے ہیں۔ ☆☆

☆ مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تحریر کاغذ کے ایک جانب صاف اور خوش خط تحریر فرمائیں۔

فقہ و فتاویٰ

محمد طاہر مدنی

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام بیچ اس مسئلے کے بابری مسجد کی تعمیر نو کے لیے جد و جہد کرنی کار ثواب ہے اور اس بارے میں خاموش رہنا گناہ ہے اس مبارک جد و جہد میں جان و مال کی قربانی دینا ایمان کا تقاضہ ہے ایسا سوچنا اور کہنا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟

امید کہ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں گے۔ مستفتی

عبد اللہ

الجواب وباللہ التوفیق

مسجد اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے اس کی تعظیم لازمی ہے اور اس کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کی بے حرمتی گوارہ کی جا سکتی ہے اللہ کے شعائر کی تعظیم ایمان اور تقویٰ کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب" (سورۃ الحج)

اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا وہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔ لہذا بابری مسجد کی تعمیر نو کی جد و جہد مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش لازمی ہے تحریک بازیابی بابری مسجد سے لاتعلقی ایک بڑا گناہ ہے اور اس تحریک کے راستے میں جان و مال کی قربانی ایمان کا تقاضہ ہے وہ جو لوگ اس جد و جہد میں کام آ جائیں وہ شہید ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے "من قتل دون مالہ فھو شہید، من قتل دون أھلہ فھو شہید، من قتل دون دینہ فھو شہید" حدیث

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو شخص اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص دین و ایمان کی راہ میں کام آ جائے وہ شہید ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے دین و ایمان کا مسئلہ ہے۔ نیز یہ مسلمانوں کی عزت و ناموس کا بھی ہے۔ اس لئے اس کی تعمیر نو کے لئے ہر ممکن جد و جہد ہونی چاہئے اور اس میں پوری امت کو شریک ہونا چاہئے۔

واللہ اعلم بالصواب

تعارف و تبصرہ

نام کتاب	اھدنا الصراط المستقیم
مؤلف	تاج الدین اشعر رام نگری
ناشر	مکتبہ تحفظ ملت رام نگر، وارانسی
قیمت	۶۰ روپے
مبصر	ولی اللہ مجید قاسمی

کتاب کے مرتب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ بنارس سے نکلنے والے روزنامہ "قومی مورچہ" کے مدیر ہیں۔ ایک صاحب طرز ادیب اور اسلام پسند صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مذکورہ کتاب ان کے اداریوں کے انتخاب پر مشتمل ہے جن کی کتابی شکل میں اشاعت کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"ان مختصر مضامین و نگارشات کی اشاعت کا خاص مقصد عام مسلمانوں کو بلا تفریق اللہ کے دین کی بنیادی تعلیمات پر عمل کرنے، دینی و اخلاقی کردار اپنانے، اللہ سے اپنا تعلق مضبوط کرنے اور آقا و مولا ہادی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کے صحابہ کرام کے طریق زندگی کو مشعل راہ بنانے کی دعوت دینا ہے۔"

۲۳ عنوانات پر مشتمل اس کتاب میں زیادہ تر مضامین میں کتاب و سنت کی طرف پلٹنے، اسلام کو عملی زندگی میں نافذ کرنے، قرآن کریم کو سوچ سمجھ کر پڑھنے اور زندگی کے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے اور اتحاد و اتفاق کی دعوت دی گئی ہے۔

عنوانات بڑے دلچسپ اور مضمون کی طرف متوجہ کرنے والے ہیں، انداز بیان نہایت سادہ لیکن اس قدر دلکش ہے کہ آخر تک پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ اشعر صاحب امت مسلمہ کے اندر

موجود امراض پر ایک نباض کی طرح انگلی رکھتے ہیں اور صحیح مرض کی نشان دہی کرتے ہیں قرآن حکیم کی ایک آیت کے سلسلے میں عام طور پر لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے اشعر صاحب بھی اس رو میں بہہ گئے ہیں چنانچہ "نشان راہ" عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

لیکن مسلمان اپنے حالات میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انھیں خود اپنے کو بدلنا ہوگا، یہ خود ان کے ہی ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ قرآن کہتا ہے "اللہ تعالی کسی پر طاری حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اپنے اندر تبدیلی لانے پر آمادہ نہ ہو۔ دلیل کے طور پر انھوں نے قرآن کی جس آیت کا ترجمہ پیش کیا ہے وہ ترجمہ غلط ہے اور مذکورہ نظریہ کے لئے اس سے دلیل اخذ کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کسی قوم پر انعام و اکرام کی بارش اس وقت روک لیتے ہیں جب کہ وہ اطاعت و فرماں برداری کی روش بدل کر نافرمانی اور سرکشی کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ جس آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسھم (رعد:۱۱) اس آیت میں قدرے ابہام ہے جس کی وضاحت اسی طرح کی دوسری آیت میں کردی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ذلک بأن اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بأنفسھم (انفال:۵۳) یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین نے مذکورہ پہلی آیت کی وہی تفسیر بیان کی ہے جس کی وضاحت دوسری آیت میں وارد ہے۔ چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں:

فکلام جمیع المفسرین یدل علی أن المراد لا یغیر ما ھم فیہ من النعم بانزال الانتقام الا بأن یکون منھم المعاصی والفساد۔ (تفسیر کبیر:۲۳)

تمام مفسرین کی بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ کسی قوم کو دی گئی نعمت کے بدلے میں انتقام اسی وقت لیا جاتا ہے جب کہ ان میں معصیت اور فساد آجائے۔

امید کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا اور احادیث وغیرہ کے حوالہ جات کا اہتمام ہوگا۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب قابل تعریف اور لائق مطالعہ ہے۔ ☆☆

جامعہ کے لیل نہار

مسجد کے بیرونی حصوں میں دورویہ شجرکاری

مسجد ایمان کی عملی مظہر گاہ بھی ہے اور اس کا مرکز ومحور بھی اسلئے اسکی تزئین ایمان سے عبارت ہے۔ مسجد جامعہ کی توسیع پایہ تکمیل کو پہنچی تو اسکی صفائی اور آرائش ایمان کا تقاضہ بن کر سامنے آتی رہتی تھی۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس تقاضے کی تکمیل اتنی بحد ذوق سے کی گئی کہ آنے والے طویل عرصے تک اسکی جدت وتازگی پر شاید کوئی حرف نہ آئے۔

پھر صحن جامعہ کی توسیع کے بعد اس کے جنوب مشرقی اور شمال مشرقی گوشوں میں سبزہ کیاری، لان بندی اور احاطہ مسجد سے متصل بیرونی حصوں میں سبزہ زاروں کی دلکشائی کے لب پر دورویہ شجرکاری ایسی بہجت افروز منظر پیش کرتی ہے کہ گلگشت چمن کی یاد تازہ ہوجائے۔

...... اور کارواں بنتا گیا

لائبریری، تعلیم اور مطالعہ وتحقیق کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اس سے استفادے کی تکمیل وتسہیل کے لئے ذمہ داران جامعہ نے جو متعدد اقدامات کئے ان میں معاون ناظر کتب خانہ کی تقرری اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ طلبہ کے روزمرہ حوائج میں جو چیز اکثر حارج ہوا کرتی تھی، اس کا سدباب ہوجائے گا اور مطالعہ کے مواقع میں مزید اضافہ ہوگا۔

چنانچہ لائبریری میں عزیز گرامی مولوی مجیب عالم فلاحی کی تقرری پر عمومی مسرت کا اظہار کیا گیا اور اسے طلبہ کے علمی ترقی کے نئے باب سے تعبیر کیا گیا۔

اس تقرری سے اس احساس کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ شعبہ اہتمام علمی وادبی اور فنی اعتبار سے طلبہ کے ذہنی ارتقاء کا نہ صرف آرزومند ہے بلکہ وہ اسے اپنی بنیادی ذمہ داری تصور کرتا ہے۔

چار کمپیوٹر سیٹ

اسلامی مدارس میں طلبہ کو عصری آگاہی بہم پہنچانے اور جدید وسائل آگہی سے انہیں روشناس کرنے اور انکی مہارت پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس عام طور پر کیا جاتا رہا ہے۔ اس خصوص سے جامعۃ الفلاح نے بہت پہلے ہی عملی جدوجہد کا آغاز کردیا تھا، چنانچہ طلبہ کے لئے کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر یہاں عرصے سے کام کررہا ہے۔

اس ضمن میں فلاحی برادران کے لئے یہ خبر بڑی مسرت آگیں ہوگی کہ اس سینٹر کو ماہ اگست میں مزید چار کمپیوٹر سیٹ مہیا کئے گئے ہیں، جس سے طلبہ کے دوسرے گروپ بھی استفادہ کرسکیں گے۔

جامعہ میں سرپرستان طلبہ/طالبات کا اجتماع

زیر تعلیم بچوں کی تعلیم وتربیت ان کے سرپرستوں کی نگرانی اور توجہ کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ ہوم ورک، نماز کی ادائیگی، کلاس کی پابندی، گھر پر روزانہ اسباق کا مطالعہ اور اسی طرح دوسرے امور کو دہرانا سرپرستوں کی نگرانی ہی پر موقوف ہے۔ تعلیم وتربیت میں سرپرستوں کی اسی اہمیت کے پیش نظر سرپرستان طلبہ/طالبات کی ذمہ داران جامعہ کے ساتھ ۱۲ اگست ۲۰۰۶ء کو بعد نماز ظہر لائبریری ہال میں ایک نشست رکھی گئی۔ جس میں تعلیم وتربیت کے جملہ مسائل زیر غور آئے اور سرپرستوں نے اپنی پوری توجہ صرف کرنے کا وعدہ کیا اور نظام تعلیم وتربیت میں موجود بعض کمیوں کی نشاندہی فرمائی۔ ذمہ داران کی جانب سے [illegible] دفتر اہتمام سے موصول شدہ خبر کے مطابق ملاقات کا یہ مفید سلسلہ انشاء اللہ برابر جاری رہے گا۔

میڈیکل کیمپ کا انعقاد

تعلیم اور صحت میں جو رشتہ ہے وہ عیاں راچہ بیاں کے مصداق ہے۔ صحت کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ۲۵ جولائی ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر کامران صاحب کی نگرانی میں ایک کیمپ لگایا گیا جس میں ڈاکٹروں کی چھ رکنی ٹیم نے حصہ لیا۔ سیکڑوں طلبہ وطالبات کا چیک اپ کیا گیا۔ انہیں متعدد امور صحت سے متعلق مفید مشورے دیئے گئے۔

چونکہ آپ کے بعد محترم ڈاکٹر کامران صاحب نے صحت سے متعلق ایک پر مغز تقریر کی۔ اسکی افادیت کے پیش نظر ذمہ داران جامعہ نے ۲۶ اگست ۲۰۰۲ء کو پھر ایک میڈیکل کیمپ کے لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ماسٹر محمد اقبال صاحب شعبہ ابتدائی نسواں میں منتقل

ماسٹر محمد اقبال قمر صاحب ایک عرصے سے شعبہ مطبخ میں تھے۔ ضرورت کے پیش نظر وہ امسال شعبہ ابتدائی طلبہ میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ جہاں سے انہیں فی الحال شعبہ ابتدائی نسواں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی ذمہ داریاں حسن و خوبی انجام دینے کی توفیق بخشے۔

اظہار تعزیت

یہ خبر دیتے ہوئے ہمیں بے حد تکلیف ہو رہی ہے کہ محترم خالد سیف اللہ فلاحی، محترم طارق اکرام اللہ فلاحی، محترم طارق انصار اللہ فلاحی صاحب کی والدہ محترمہ اور استاذ محترم مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب و مولانا سلامت اللہ صاحب اصلاحی کی بڑی بہن جو کافی دنوں سے علیل تھیں ۱۹ اور ۲۰ راگست کی درمیانی شب میں اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ۲۰ راگست کو تجہیز و تکفین ہوئی۔ موصوفہ کافی دیندار اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ جامعہ سے آپ کو گہری عقیدت اور کافی لگاؤ تھا۔ ادارہ حیات نو پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور خدا سے دست بدعا ہے کہ وہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

ایسے ہی یہ خبر بھی ہمارے لئے باعث رنج و غم ہوگی کہ حیات نو کے سابق کاتب اور منیجر جناب اشفاق عامر صاحب کی بہن ایام زچگی میں ۱۸ اگست کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ حیات نو پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دست بدعا ہے کہ وہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔